۱۴۴۸۱۵
۹۲۰

UNIVERSAL LIBRARY
OU_188810
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩٢٠ Accession No. ۱۵۳۳۷

Author ایل ایم ساوے

Title تاریخ ادبیات

This book should be returned on or before the date last marked below.

خارزارِ حیات

از

ایل۔ ایم۔ سائوے

انڈیا بک ہاؤس
عابد روڈ حیدرآباد دکن

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

۱۵۲۲۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایل۔ ایم۔ سائوے
دوبل گوڑہ حیدرآباد دکن

تعداد طبع ایک ہزار

مطبوعہ
انتظامی پریس شنکر باغ حیدرآباد

"نوجوانانِ دکن کے نام"

پیش لفظ

ہاں اہل بزم ہے کوئی نقاد سوز دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

کسی کتاب کا پیش لفظ یا تعارف نامہ لکھنے کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو جاہ و ثروت، مرتبے یا ادیب کی حیثیت سے مشہور ہو جس کے نام سے کتاب کی قدر و منزلت کو چار چاند لگ جائیں لیکن اس عجیب سوانح حیات کے پیش لفظ لکھنے کے لئے مسٹر ساؤلے نے مجھے انتخاب کیا جو خود بھی اپنے سے واقف نہیں کسی اور کا جاننا اور واقف ہونا درکنار!

تقریباً ایک سال سے کچھ زاید عرصہ ہوتا ہے جب مسٹر ساؤلے سے میری ملاقات ہوئی۔ ملاقاتیں ہوتی ہی ہیں لیکن ان کی گفتگو سے میں کچھ ایسا متاثر ہوا کہ دوبارہ ملنے کی خلش دل میں لے کر اٹھا۔ دوسری ملاقات میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سلسلہ گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ صحرائے افریقہ کی بھی عرصے تک صحرانوردی کر چکے ہیں جہاں سیر و شکار کے علاوہ ایک مدت تک جنگ عظیم میں بطور سیاسی قیدی کانگرسی ہونے کے باعث جیل بھی بھگتنی پڑی اور تختہ دار پر لٹکائے جانے کے احکامات بھی حکومت نے دیئے لیکن

جنگ ختم ہونے کے باعث اتفاقیہ بچ گئے ہاتھی کے شکار میں جن عجیب و غریب حادثات سے دوچار ہونا پڑا سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ ان حیرت انگیز واقعات کو سن کر میں نے عرض کیا کہ یہ تجربات زندگی نوجوانوں کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہ کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ فرمانے لگے کہ مراٹھی کے ایک پرچے میں کئی سال قبل یہ باقساط شایع ہو چکے ہیں جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ ترجمہ بہت مختصر سا تھا۔ البتہ اس میں اس امر کی گنجائش تھی کہ اگر اسے باقاعدہ مرتب کیا جائے تو ایک ادبی کتاب کا درجہ مل سکتا ہے۔ میری سرکاری مصروفیتیں اتنی زیادہ تھیں کہ اس کام کے لئے وقت نکالنا دشوار تھا۔ چنانچہ میری نظر انتخاب مولانا فصیح انصاری پر پڑی۔ جو اُن دنوں دواخانہ عثمانیہ میں زیر علاج تھے۔ میں عیادت کے لئے دواخانہ گیا۔ اُن کی حالت خراب تھی لیکن میں نے اس کا تذکرہ کر ہی دیا۔ اللہ اللہ مرحوم میری بات کبھی نہ ٹالتے تھے۔ استاد ہونے کے باوجود میرے ساتھ دوستوں کا سا سلوک کرتے۔ میں نے ترجمہ کے اوراق اُن کے حوالے کر دئے اور انھوں نے بستر مرگ پر ہی اس سوانح کو اس رنگ میں رنگ دیا جسے شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اول تو واقعات ہی کچھ ایسے حیرت انگیز اور عجیب ہیں اس پر فصیح مرحوم کی رنگینی عبارت !!

اس کتاب کو ترتیب دے کر کئی ماہ ہوئے لیکن مسٹر ساؤے کی گوناگوں مصروفیتیں اسے شائع نہ کرا سکیں۔ موصوف کی عمر اس وقت ساٹھ سے تجاوز ہے۔ بظاہر ایسے توانا بھی دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن اُن کے خیالات

اور جذبات نوجوانوں سے زیادہ پرجوش ہیں۔ انہیں اہل ہند کی غلامانہ ذہنیت
دیکھ کر انتہائی تکلیف ہوتی ہے۔ عرصہ قبل ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔
مشتاق صاحب! اہل یورپ کی کامیابی کا کیا راز ہے؟ اُن کی حکومت پر
سورج کیوں غروب نہیں ہوتا؟ وہ متمول بھی ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان
کا کثیر طبقہ نان شبینہ کو محتاج ہے۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا تک میسر نہیں۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ اہل یورپ زمانہ امن میں کامیاب تاجر اور زمانہ جنگ میں
اعلیٰ سپاہی ہوتے ہیں۔ وہاں دو قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مانا کہ تاجر
بننے سے ہمیں کون روکتا ہے۔ مگر افسوس ہمارے نوجوان اس طرف متوجہ
نہیں۔ وہ ہزاروں روپے کی منفعت والی تجارت کے مقابلے میں تیس روپے
کی غلامی کو ترجیح دیں گے۔ جہاں غلامی اتنی عزیز ہو۔ اس ملک کی آزادی
کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ جب تک ہماری ذہنیتوں میں غلامی کی بو آتی رہے گی
ہم ہمیشہ غلام رہیں گے۔ میں نے عرض کیا تو آپ ان کی ذہنیتوں کو بدلنے کی
سعی فرمائیے۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ بے شمار مثالیں آپ کے سامنے ہیں
کہ تنہا آدمیوں نے قوموں اور ملکوں کی حالت میں عظیم تغیر پیدا کر دئے۔
کہنے لگے میں اسی قسم کی فکر میں ہوں۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نوجوان
تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں سے غلامانہ خیالات نکال دوں۔ چنانچہ ایک اسکیم
میں نے مرتب کی ہے جس کے ذریعہ نوجوانوں کو غلامی کی قید و بند سے آزاد
کر کے کھلی اور آزاد فضا میں لا کھڑا کروں گا۔
یس
آپ کئی مہینوں کی سعی پیہم کے بعد وہ اسکیم بفضلہ "دی ایسوسیٹیڈ سٹوڈنٹس ہیڈ سیلرز

کے نام سے مملکت آصفیہ میں لمیٹڈ ہو گئی ہے۔ ریاست ایک مدت کی حد تک اس کے ذریعہ کاٹیج انڈسٹری میں ایک انقلاب انگیز تغیر حال پیدا ہو جائیگا۔ اس اسکیم کے اصول اساسی کے مطابق صناعوں اور کارخانہ داروں کے درمیانی واسطے دور کر دئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کی شاخیں ہندوستان کے دیگر بڑے تجارتی شہروں میں بھی قائم ہوئے گی۔ وقت واحد میں کم از کم دو تین سو نوجوان گریجویٹ کام کر سکیں گے۔ اور تربیت اس نہج سے دی جائے گی کہ تھوڑے عرصے بعد ہی وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ خود اعتمادی کے ساتھ خود مختارانہ کام کر سکیں گے۔

میں نے اس اسکیم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور سمجھا۔ مجھ پر اس کا جو اثر ہوا اس سے متاثر ہو کر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس اسکیم کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں میں تجارتی ذوق پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ اسکیم بھی مسٹر ساوئے کے انہی جدت آموز خیالات و رجحانات کا نتیجہ ہے جسے آپ دوران مطالعہ "خارزار حیات" محسوس فرمائیں گے۔ ایسے ہی جذبات کی حرارت سے اس عمر میں بھی انکا خون آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ گرمی کا سرمایہ رکھتا ہے۔

گرچہ پیرم دلے عشق چوں دم ساز آید
باز ہنگام نشاط و طرب و ناز آید

مشتاق

فہرست

فہرست (یاد ایام)		ایک خاص باورچی ؟	۳۰
ابتدائی زندگی	۱۳	احمد آباد کو روانگی ۱۹۰۳ء	۳۲
زندگی کی آٹھویں منزل	۱۴	افریقہ	۳۳
گھر کے نئے زمین و آسمان	۱۵	ممباسہ کی زندگی موہن لال گاندھی سے ملاقات	۳۴
بڑودہ میں قیام	۱۷	میرا مضحکہ خیز سفر	۳۶
ماموں صاحب کی صحبت کا اثر	۱۷	فرانسیسی بندرگاہوں سے گزر	۳۷
امتحان میٹرک میں کامیابی	۱۸	اچھوت کے خلاف مہم	۳۸
زندگی کی پہلی ملازمت	۱۹	زنجبار	۴۰
میرے صندوق پر ایک چوٹی	۲۰	موہن لال گاندھی کیلئے اسٹیمر میں	۴۲
مدرسی کی خدمت	۲۲	میری ملازمت	۴۳
کرنل اوبرین میرے شاگرد کی حیثیت سے	〃	اسٹیمر سے جزیرہ ٹنگایا کو	۴۵
درس تدریس کے مشغلے پر ایک نظر	۲۳	کیپوکو مگر مچھ جانشین	۴۶
تجارت کا اصول	۲۴	مگر مچھ کے انڈے اور رہبری	۴۸
احمد آباد میں پھیری کی دکان	۲۴	دو حادثے ...... ؟	۴۹
دوکان کا پہلا دن	۲۶	خونی لہروں کے منہ سے نکلنا	۴۹
کانگریس ۱۹۰۲ء (احمد آباد)	۲۷	سانپ سے مقابلہ	۵۰
قدرت کی فیاضیاں	۲۸	دریائے نیل کا منبع	۵۲
احمد آباد کی دوکان	۲۹	دو قابل فراموش ملاقاتیں	۵۲
شادی کی پیشکش اور میرا انکار	۲۹		

پھر اینٹے میں	۵۴
اسٹے کا غذ پر دستخط	۵۵
نیمولے میں	۵۶
لوہے کی کشتی میں سفر	۵۷
نیمولے آنے کی خوشی	۵۸
تجارت	۵۹
رام بھاؤ لوکھنڈے کی اچانک موت	۶۰
میری خطرناک علالت	۶۱
رشوت ستانی کے موقع	۶۲
ڈاکٹر اسٹونی کے ہاتھی نے ٹکڑے کر دئے۔	۶۲
منڈی میں	۶۳
اسسٹنٹ کلکٹری ہاتھی کے شکار ہو گئے۔	۶۴
میرا تقرر	۶۵
ہلکاری کے پردے میں اسسٹنٹ کلکٹری	〃
حکام کا رویہ ماتحتوں کے ساتھ	۶۶
مسٹر انڈرسن کی تشریف آوری	〃
مسٹر انڈرسن کی سختی	۶۷
جیسے کو تیسا	۶۸
سر نہ کہنے کا جرم اور اس کی سزا	۶۹
دلچسپ مکالمہ	〃
صاحب بہادر بدل گئے	۷۲
ہاتھی کا شکار	۷۴
کالی بارود	۷۵
کارڈائٹ بارود	۷۶
سلیقہ شکار	۷۷
شکار کا اجازت نامہ	۷۸
ہاتھی کے شکار کے لئے۔ ۹	۷۹
ایک ہفتہ کے لئے دوسرا شکار	۸۳
ہاتھیوں کا تماشہ!	۸۴
بھالے سے ہاتھی کا شکار اور اس کی دردناک سزا	۸۵
عدالت کی بوالعجبی	۸۶
غلاموں کا مقام	۸۷
میرا پہلا کامیاب شکار	۸۹
ہاتھی کے حصے بخرے	۹۰
ہاتھی دانت کی قیمت	۹۲
یورپین شکاری	〃
ہندوستان کو روانگی اور شکار کا اتہام	۹۳
پونہ کی سیر	〃
چند آنسوں اور چند آہیں	〃
مرہٹوں کی پست حالی	۹۵
ہندوستان سے آفیسر کو واپسی ترک ملازمت	۹۸
مستقل مشغلہ شکار	۱۰۰
پھر منڈی کو	〃
شراب سے علاج	۱۰۱

سعی لاحاصل ناکامی نما کامیابی	۱۰۳
کامیاب شکار	۱۰۵
نئے اجازت نامہ کا حصول اور خطرناک مناظر	۱۰۸
ہاتھیوں کے ہجوم میں	۱۰۹
کان کے پاس ہے گولی	۱۱۲
کانگو کو براہ منڈی، روانگی	۱۱۳
بلجین علاقے میں شکار	۱۱۴
خونخوار وحشیوں کے محاصرے میں	۱۱۵
ہاتھیوں کے جنگل میں	۱۲۰
میرا پہلا شکار	۱۲۱
مجھے مبارک بادی	۱۲۲
میرا فرار	۱۲۴
پیٹیل پر حملہ	۱۲۵
ایک اور افتاد	۱۲۷
شکاری خود شکار کے پھندے میں	//
جما کی آپ بیتی	۱۲۹
یہ مصیبت کیوں نازل ہوئی	//
بمباسہ کو واپسی	۱۳۰
بمباسہ میں کارروباد	//
ہندوستان کو واپسی	۱۳۱
ہندو دھرم کی تنگ نظری	//
افریقہ کو واپسی	۱۳۴
ساؤلے سیاست کے میدان میں	۱۳۴
انڈین ایسوسی ایشن	//
حالات کا جائزہ	۱۳۵
میرا ذاتی کاروبار	۱۳۷
ساؤلے موت کے تختہ پر	۱۳۸
میری گرفتاری	۱۴۰
میری بیوی کی ہوشیاری	۱۴۱
ایران بلا کا تعارف	۱۴۲
مجرم ہاکھ	۱۴۴
ساؤلے والے جیل میں	۱۴۴
ہمارے پہرہ دار	۱۴۵
ایران نو	۱۴۶
ایک قیدی کی جرأت	۱۴۶
کچھ ایرانِ بلا۔	۱۴۷
ملازموں کا حشر	۱۴۸
ایک خوفناک نظارہ	//
سوالات اور سازش	۱۴۹
پولیس کی کوشش	۱۵۰
کورٹ مارشل کا فیصلہ وہی قاتل وہی منصف وہی شاہد ٹھہرے	۱۵۱
تار بنام گورنر	۱۵۳
ہماری حالت	۱۵۴
ہمکو سزائے موت	۱۵۴
تختہ دار پھانسی کی سزا	۱۵۵
جاسوس کا پتہ	۱۵۶
میرا دفتر	۱۵۷

فیصلہ	۱۵۹
ہمارا حال	۱۶۱
موت ملتوی	۱۶۲
جیل میں	۱۶۳
رہائی	۱۶۷
جیل کی زندگی	۱۶۹
چند شہیدان ستم	۱۷۰
ہندوستان کے پروردہ گوروں کے مظالم	۱۷۲
ہندوستانی سپاہیوں پر	″
بانا بکاری عرب قیدی کی رہائی اور اس کے بھائی کی موت	۱۷۲
مسٹر بھیسے کے کرتوت	۱۷۴
چاہ کن راہ چاہ در پیش	۱۷۵
فریضۂ انسانیت	۱۷۶
حاجی وارڈ بوائے	۱۷۷
محفل میلاد نبوی میں بے ادبی کی سزا	۱۷۸
راما نند کا انجام	۱۸۱
ہندوستانی فوج کا کارنامہ شجاعت	۱۸۱
شمالی افریقہ میں جرمن فتوحات	
قید میں میرا ایک عجیب مشغلہ	
کچھی مسلمانوں کا مقدمہ قتل	۱۸۴
پھانسی کا عبرتناک نظارہ	۱۸۶
قیدو بے قیدی پر ایک طائرانہ نظر	۱۸۸
ہماری رہائی کے متعلق گفتگو اور اس کے نتائج	۱۸۹
ایک بیرسٹر صاحب خط نصیحت	۱۹۲
پھر وہی میدان اور وہی دوڑ	۱۹۴
کانگریس میں از نو شرکت	۱۹۵
کوسٹ عرب ایسوسی ایشن	۱۹۸
سوشل سروس لیگ	۱۹۹
ہندوستان کو واپسی	۲۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

یادِ ایّام

ابتدائی زندگی

میں کہاں پیدا ہوا، سنتا ہوں کہ علاقہ کوکن میں۔ میں نے چشم شعور کھلنے کے بعد اپنے مقام ولادت کو آج تک نہیں دیکھا۔ میری چار برس کی عمر تھی کہ والد ماجد (خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے) اپنے ہمراہ کوکن سے گجرات لے آئے۔ بخت و اتفاق نے یوں تو تمام دنیا کی خاک چھنوائی مگر وہاں ایک بار بھی نہیں پہونچایا جہاں میں پیدا ہوا۔ قسمت بھی کتنی ہٹیلی اور کتنی ضدی ہوتی ہے —!

ہر انسان کو اپنی جنم بھومی سے دلی لگاؤ ہوتا ہے۔ مجھے بھی کوکن سے اس علاقے کی بنا پر معنوی تعلق ہے۔ آج بھی اس پاکیزہ سرزمین کے لئے میرے دل کی تنہائیوں میں نجانے شوق و اضطراب کے کتنے پرجوش ہنگامے بپا ہیں۔ اور اُس کی یاد سے میری آنکھوں میں کتنے حسرت اور یاس کے آنسوؤں کے کتنے خاموش طوفان اٹھ رہے ہیں اسے میرے سوا کوں جان سکتا ہے۔؟

زندگی کی آٹھویں منزل میں نے روز پیدائش سے آٹھ سال تک ایک ایسے شہر میں، رسیلی، اور لطیف زندگی بسر کی جسے میری تمام عمر کا حاصل سمجھنا چاہئے۔ والد ماجد کی محبت بھری نگاہ اور والدۂ مکرمہ کی پرازشفقت آغوش یعنی کائنات کی بیش بہا تریں دولتوں سے میرا دامنِ وجود بھرپور تھا، میرے وہ ماں باپ جو میرے لئے سعادت و محبت کے سرچشمے تھے۔ ان پر اس دکھ بھری دنیا میں خدا کتنی ہی قیامتیں کیوں نہ ٹوٹی ہوں کتنی آفتیں نہ منڈلائی ہوں مگر مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں تو اُس بہشت ارضی میں تھا جسے ماں کی چاہت اور باپ کی نازکشی نے میرے لئے سجایا تھا۔ میرے لئے یہ ایک ایسا چمن تھا جس میں غم کے باد سموم کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی کبھی نہیں آیا۔

مگر افسوس یہ بہشت، بہشت کا ایک خواب ہی نکلی اور اس کی مسرتیں مسرتوں کا کم مرفریب۔ آٹھویں سال جو آنکھ کھلی تو پھر میں بالکل ننھی مایہ، اور محروم تھا نہ میرے سر پر باپ کا سایۂ رحمت، اور نہ میری جانب

ماں کی شفقتوں کی رنگینیوں ڈوبی ہوئی نظر آب میں بالکل ہی مفلس تھا میری ساری دولت، چھن چکی تھی، بچے کا سارا دھن دولت اُس کے ماں باپ ہیں، جب وہی نہ رہے تو پھر اُس کے پاس کیا رہ جاتا ہے دنیا اُس کے لئے ایک گہوارۂ ابتلا بنکر رہ جاتی ہے اور ساری وسیع کائنات اُس کے لئے ایک تنگ زندان مصیبت ہو جاتی ہے جس کی ہر ساعت فتنہ ریز۔ اور ہر آن قیامت بدوش! معاذ اللہ!!!

پندرہ یوم کی مختصر سی مدت میں مجھ پر یکے بعد دیگرے مصیبت کے دو پہاڑ پھٹ پڑے پہلے والدۂ مکرمہ مجھے اپنی محبت و شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر کے اس دنیا سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئیں اُس کے بعد اُسی عشرہ میں جناب والد ماجد بھی اس جہان خاک سے سدھار کر جنت کے عازم ہو گئے۔

الغرض قدرت نے زندگی کی پہلی ساعت میں مجھے جو کچھ دیا تھا وہ زندگی کے آٹھویں سال مجھسے چھین لیا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!!

گھر کے نئے زمین و آسمان

والدین کے انتقال کے بعد میری دنیا ہی بدل گئی تھی گھر اور گھر کی زمین اور چھت تک بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر چیز پر اداسی، مایوسی، اور خاموشی چھائی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ گھر کی ساری کائنات پر اچانک سکتہ سا طاری ہو گیا ہے، ذرے ذرے کو

کابوس کی بیماری نے جکڑ لیا ہے۔

گھر میں نے دیکھے میرے دو بھائی تھے جن میں سے ایک دس روپیہ ماہوار کے پٹواری ہو گئے تھے اور دوسرے بھائی بھی اسی طرح کی ایک معمولی خدمت پر دقت گزاری کرنے پر مجبور تھے۔ میرے دونوں بھائیوں نے میرے ساتھ انتہائی برادرانہ محبت اور خلوص اخوت سے تعلقات قائم رکھے، میں حصول تعلیم میں مصروف ہو گیا اور کچھ دنوں کے بعد امریلی (کاٹھیاواڑ) کے ایک اسکول سے جماعت ششم میں کامیابی حاصل کی۔ حالات ناگفتہ بہ تھے۔ معاش اور مصارف تعلیم کے حصول کے لئے دشواریوں کا سامنا تھا۔ میں نے اسی مختصر سی تعلیم کو سردست کافی متصور کیا۔ اور یہ خیال ہوا کہ جس طرح اور میرے بھائی ملازمت کر رہے ہیں۔ میں بھی اس قسم کی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کم از کم تلاٹی یا اہلکاری کی کوئی خدمت مل ہی جائے گی۔ آدمی ماحول سے بھی کس قدر متاثر ہوتا ہے میں نے آنکھیں کھول کر جو کچھ اپنے گھر میں دیکھا۔ اُس کا کتنا گہرا اثر میرے خیالات پر پڑا۔ اب گویا ایک ملازمت اور وہ بھی معمولی ملازمت بہ گویا میرے لئے معراج الکمال کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اور گویا ملازمت جیسی ایک مہذب غلامی کہنا چاہئے۔ میری زندگی کا نصب العین بن گئی تھی۔

قدرت کی مہربانیاں مخفی ہونے کے باوجود کتنی موثر ہوتی ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا خیال بلکہ غلط اندیشی کے تحت جب حصول ملازمت کا

عزم کیا تو میری عمر کی کمی اس سے مانع ہوئی کیونکہ اس وقت میں صرف ۱۱ سال کا تھا اور اس عمر میں کوئی سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی

بڑودہ میں قیام

آخر سب کے مشورے سے میں اپنے ماموں صاحب کے پاس ریاست بڑودہ گیا اور وہاں انگریزی تعلیم شروع کر دی ماموں صاحب کی ایک دوکان تھی جس میں چائے چینی اور دیگر معمولی مٹھائیاں اور نمکین اشیاء فروخت کی جاتی تھیں میں جب پڑھنے سے فرصت پاتا تو ماموں صاحب کی مرضی یا ایما سے نہیں بلکہ خود اپنی خوشی سے اُن کی دکان میں کام کرتا۔ خریداروں کو سودا دیتا۔ چائے کی پیالیاں اور دوسرے برتن دھوتا اور جو کام ہوتے اُن کو انجام دیتا۔ اس سے میرا اپنا مقصد یہ تھا کہ میں محنت کا عادی ہو جاؤں ورنہ ماموں صاحب مجھے منع فرمایا کرتے اور کھیلنے کی تاکید فرماتے لیکن مجھے کھیلنا یا فضول مشاغل میں اوقات ضائع کرنے سے یہی بہتر معلوم ہوتا تھا کہ میں کام کرنے کی عادت ڈالوں اور ماموں صاحب کا کچھ ہاتھ بھی بٹاؤں۔

ماموں صاحب کی صحبت کا اثر

میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ آدمی ماحول سے متاثر ہوتا ہے گھر پر جس ماحول سے میں متاثر ہو کر قبل از وقت ملازمت کا خواہشمند ہو گیا تھا چونکہ اب وہ ماحول نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ خیالات بھی نہیں رہے تھے۔ جدید ماحول نے جدید خیالات کی پیدائش اور

پرورش کی۔ ماموں صاحب نہایت آزاد خیال، بلند نظر اور پاکیزہ فطرت واقع ہوئے تھے۔ وہ عموماً ملازمت اور خصوصاً سرکاری ملازمت کو بہت ہی بری نظر سے دیکھتے اور اسے انسانیت کی توہین خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہی وہ سرکاری ملازمین سے بھی نفرت کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے سرکاری ملازم کو اس کی تنخواہ اور عہدے کی مناسبت سے ذلیل اور کمتر متصور کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرکاری ملازمت انسان سے ہر پاکیزہ صفت، اور ہر بلند اخلاقی چھین لیا کرتی ہے۔ میں وقتاً فوقتاً اُن کے ارشادات سنتا اور غور کرتا تو مجھے یہ محسوس ہوتا کہ مجھے میرے دل اور دماغ میں روشنی بھرتی اور تاریکی نکلتی جا رہی ہے۔ ماموں صاحب کی صحبت نے میرے خیالات میں نہایت مبارک اور حسین انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ایسے نقوش مرتسم کر دیئے جو سالہا سال گزرنے کے بعد آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

امتحان میٹرک میں کامیابی

میں ماموں صاحب کے پاس دو سال رہا اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ بھائیوں کے پاس سے چار چار پانچ روپیہ ماہوار آنے لگے۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ ماموں صاحب کے پاس سے ہٹ کر الگ زندگی گزارنے کا سلیقہ پیدا کروں چنانچہ میں اُن کے پاس سے الگ ہو گیا۔ اب میری معاش کے لئے بھائیوں کی بھیجی ہوئی امداد کے سوا دو تین روپیہ ماہوار کا ایک ٹیوشن کر لیا اور دو تین روپیہ بر گرآنوں

کی ہٹیریاں بناکر مدرسے کے لڑکوں کے ہاتھ فروخت کرنے سے حاصل ہو جاتی اس طرح میں گزر اوقات کرنے لگا - امریلی چھوڑنے کے ۵ سال کے بعد میں نے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

زندگی کی پہلی ملازمت

میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں نے چاہا کہ کالج کی تعلیم شروع کروں لیکن مرض بواسیر کی تکالیف نے اس درجہ صحت خراب کر دی تھی کہ شوق تعلیم کا گلا گھونٹنا پڑا، اور حصول علم کا مبارک مشغلہ ترک کر دینا پڑا۔

بیماری کا یہ تقاضہ ہوا کہ میں بغرض تبدیل آب و ہوا کسی جگہ جاؤں اس کے لئے امریلی مناسب سمجھا گیا۔ میں امریلی آیا مگر بیکاری بھی تو ایک مستقل روگ ہے کچھ دنوں بعد ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا سخت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کسی آزاد پیشہ اختیار کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ سرمایہ ہونا چاہیئے اور میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ گو ماموں صاحب کی صحبت نے مجھے ملازمت سے متنفر کر دیا تھا تاہم سردست کچھ نہ کر سکنے کی صورت میں یہی مصلحت سمجھی گئی کہ بس عارضی طور پر ہی سہی کوئی ملازمت کر لوں۔ بہرحال بالکل خالی وقت گزارنے سے کچھ نہ کچھ کرنا بہتر ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے ملازمت کی جستجو کی اور امریلی کی عدالت سیشن میں بارہ روپیہ ماہوار کی ایک خدمت بلا دقت مل گئی۔ میں نے کہا چلو غنیمت ہے وقت بھی کٹے گا اور کچھ پیسے

بھی حکومت کے خزانے سے وصول ہو جائینگے۔

یہ بارہ روپیہ بحساب سکہ شاہی تھے جس کے ۱۰ کلدار (انگریزی) ہوتے ہیں گویا میں دس روپیہ سات آنے ہی ماہوار کا ملازم تھا۔ میرے سپرد دیوانی کے مقدمات کی پیشیاں مقرر کرنا تھا اس دفتر میں انگریزی تعلیم یافتہ اہلکاروں میں میرے سوا ایک اور اہلکار شنکر راؤ نامی تھے۔ ان کی مدت ملازمت دس سال کی ہو چکی تھی اتنی طویل مدت گزرنے پر اب ان کی تنخواہ ۲۰ سکہ یا باشاہی تھی یعنی بحساب سکہ انگریزی (کلدار) ۱۶ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ۱۶ پانے کے لئے مجھے کم از کم دس سال چاہیں۔

میرے صندوق پر ایک چونی۔؟

ابھی مجھے زمرہ ملازمت میں داخل ہوئے چار ہی روز گزرے تھے کہ ایک شخص نے آکر ایک چونی میرے صندوق پر رکھدی۔ اور یہ کہا کہ یہ نذرانہ ہے آپ براہ کرم میرا مقدمہ جس کی پیشی فلاں تاریخ کو مقرر ہے اسے تبدیل فرماکر فلاں تاریخ پر کر دیجئے۔ یہ پہلی رشوت کی رقم تھی۔ جو میرے سامنے آئی۔ اور یہی آخری رقم بھی تھی کیونکہ اس کے بعد میں نے کبھی کسی صاحب معاملت کو اتنا جری نہیں ہونے دیا کہ وہ اس قسم کی ناجائز رقم میرے سامنے پیش کرتا۔ میں نے اس کی فرمایش کی تکمیل کر دی اور سختی سے کہا کہ اپنی یہ چونی اٹھالو اور آیندہ سے ایسی حرکت نہ کرنا

اس چوٹی نے میری آنکھیں کھولدیں۔ میرے سامنے خیالات کی دنیا میں کشمکش پیدا کردی۔ میں نے سوچا کہ تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ وہ کسی طرح بھی ضروریات حیات کی کفالت نہیں کرسکتیں۔ قلیل مشاہرے والے اہلکار اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر یقیناً ایسے ناجائز نذرانے (رشوت کی رقمیں) قبول کرتے ہونگے اور یہ دیانت کے خلاف ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کل کی حکومتوں کی ملازمت کرکے کوئی شخص دیانت داری سے زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ بالفاظ واضح ہر حکومتیں اپنے اہلکاروں کو خود مجبور کرتی ہیں کہ وہ رشوتیں لیں۔ اگرچہ بظاہر رشوت دینا اور رشوت ستانی دونوں جرم ہیں مگر اس سے بڑھکر بوالعجبی اور کیا ہوگی کہ حکومت خود ہی قانون بناتی ہے اور خود ہی ایسی حکمت عملی اختیار کرتی ہے کہ خوب رشوتیں لی جائیں اور دی جائیں اس ایک معمولی سے واقعہ نے میرے دل میں ملازمت کی جانب سے جو جذبات نفرت تھے اوس میں قوت پیدا کردی مجھے خیال ہوا کہ میری تنخواہ اور اکثر اہلکاروں کی طرح اتنی قلیل ہے کہ اس میں کسی طرح گزر ممکن نہیں۔ دوسرے اہلکار اس کمی کو کسی نہ کسی قدر رشوتوں سے پورا کر لیتے ہیں کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں بھی یہ طرز عمل اختیار کروں۔ میرے ضمیر نے اس ناپاک خیال کو بری طرح ٹھکرا دیا۔ کہ ایسی زندگی سے فاقہ کشی کرکے مرجانا لاکھ درجہ بہتر ہے۔

میں نے غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ حصول رزق کے وسائل میں سب سے برا وسیلہ ملازمت ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان جفاکشی

کرے، محنت مزدوری کرے اور پیٹ کی آگ کو بجھائے۔

میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ میں ملازمت ترک کردوں گا۔ میرے بس کا یہ روگ نہیں۔ لیکن میرے احباب و مخلصین نے میرے اس خیال کی شدید مخالفت کی کہ ایک ملی ہوئی مستقل ملازمت اور قابل وظیفہ کو ترک کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

مدرسی کی خدمت میں نے کسی نہ کسی طرح چار پانچ ماہ یہ بار ملازمت اٹھایا۔ اتفاق سے وہاں کے ہائی اسکول میں مدرسی کی ایک ہنگامی خدمت چھ ماہ کے لئے بشاہرہ ۲۵ روپیہ مل گئی۔ میں نے اس عدالتی ملازمت کے مقابلے میں اس کو غنیمت سمجھا۔ اور فوراً استعفا دیکر بچوں کی خدمتگری شروع کردی۔ گو یہ ملازمت مستقل نہ تھی۔ صرف چھ ماہ کی قلیل مدت کے لئے تھی۔ لیکن ضمیر و ذوق کا جبقدر خون عدالت کی ملازمتوں میں ایک شریف انسان کو کرنا پڑتا ہے تعلیمات کی ملازمت میں نہیں۔ اس لئے میں نے ایک وقتی ملازمت کو مستقل ملازمت پر ترجیح دی گو بعض احباب نے میرے اس فعل کی کافی مذمت کی لیکن میں نے کوئی پروا نہ کی۔

کرنل اوبرین میرے شاگرد کی حیثیت سے اس مدرسی کی ملازمت کے ساتھ مجھے دو ٹیوشن بھی مل گئے۔ جن میں ایک تو کولھاپور اسٹیٹ کے برٹش رزیڈنٹ کرنل اوبرین تھے جو مجھ سے مرہٹی زبان اور مرہٹی ادبیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور

دوسرا ٹیوشن بھی ایک اچھے خاندان کے طالب علم کا تھا۔ اب ٹیوشن اور اسکول کی تنخواہ ملاکر میری ماہانہ یافت ۵۰ (پچاس روپیہ) ہو گئی تھی۔

درس تدریس کے مشغلے پر ایک نظر مدرسی کا پیشہ اس لحاظ سے نہایت بہتر ہے کہ اُس سے دوسرے لوگ علمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے اس مشغلے کی اہمیت ظاہر ہے۔ مگر اس لحاظ سے کہ ایک مدرس عام حالات میں خود اپنے لئے کچھ زیادہ سود مند نہیں ثابت ہوتا کچھ زیادہ مفید مشغلہ نہیں۔ کیونکہ وہ کثرت کار اور شدت مصروفیت کی بنا پر اس کا موقعہ نہیں پاتا کہ خود اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ اسکول کی حاضری، گھر پر طلبہ کی کاپیوں کے انبار کی دیکھ بھال۔ ڈائری کی تحریر، اسباق کی تیاری اتنے کام انجام دینے کے بعد مدرس کو کہاں اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ مطالعہ میں مصروف ہو کر اپنے علم کی سطح کو اونچا کرے۔ بس ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں تمام زندگی وہ چکر لگاتا رہتا ہے اور اس کے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، ایسے لوگ بہت ہی شاذ ہیں جو مدرس کا پیشہ کرتے ہوئے اور اس کے تمام آداب و فرائض کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی ذاتی علمی ترقی کر سکے ہوں، ایک مدرس جس روز ملازمت میں داخل ہوتا ہے۔ اور جس روز، وہ وظیفہ لیکر اس خدمت سے سبکدوش ہوتا ہے اوس کی علمی سطح ان دونوں دنوں میں تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔

شہرہ آفاق گھوکھلے اور پرانجپے جیسی ہستیاں از قبیل مستثنا تھیں
میرا مقصد مدرس کی ملازمت اختیار کرنے سے یہ تھا کہ میں کفایت
شعاری سے کچھ روز زندگی گزاروں جس قدر رقم پس انداز کر سکوں کر لوں پھر
اُس چھوٹی سی پونجی سے کوئی چھوٹی سی تجارت کروں۔ جو باوجود محنت طلب
ہونے کے حصول رزق کا میرے نزدیک سب سے بہتر اور ذی عزت ذریعہ
ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس ملازمت میں میں نے جہاں تک ہو سکا
کفایت شعاری کے ساتھ محتاط زندگی بسر کی اور تھوڑی سی رقم
جمع کر لی۔

تجارت کا اصول اس میں کلام نہیں کہ کاروبار کے لئے کافی رقم
کی ضرورت ہے مگر یہ خیال کرنا کہ کام شروع
کرنے کے لئے۔ کافی رقم کا ہونا ضروری ہے۔ صحیح نہیں اگر کام کرنے
والا محنتی جفاکش متقل مزاج۔ دیانت دار کفایت شعار ہے تو تھوڑی
سی رقم سے بھی کام کو شروع کر کے کچھ دنوں میں اپنی حالت سنبھال
سکتا ہے۔ رقم کی کمی محنت، استقلال، اور دیانت، اسے پوری
ہو سکتی ہے۔ میرے سامنے بس یہی حقیقت تھی۔

احمد آباد میں پھیری اور دکان میں احمد آباد اس وقت
تک زندگی میں صرف ایک
بار بیرسٹر کا امتحان دینے گیا تھا، وہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا، اس
لئے میں نے اپنی محنت، وجفاکشی کے لئے اُس کو منتخب کیا کہ وہاں کوئی

انگشت نمائی کرنے والا نہیں۔ اس خیال کے تحت میں احمد آباد گیا۔ میری جیب میں چھ روپیہ تھے۔ میں نے چنبیلہ اور دال سیو وغیرہ کا ایک خوانچہ مرتب کیا۔ اور گلیوں گلیوں پھیری لگانے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے ہی روز مجھے منافعہ ہوا۔ اس طرح مجھے پورا مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک چھوٹی سی دکان پانچ روپیہ ماہوار پر لی۔ معمولی دو دھیا کی بنچ، میز اور کرسیاں بنوا کر رکھیں، اور سستے قسم کا چائے کا سامان، کیتلی، پیالیاں وغیرہ بھی خرید کر سلیقہ سے جما دیں۔ چائے کے سوا نمکین چنبیلہ بھجیے۔ لڈو، سری کھنڈ، وغیرہ اشیاء خورد و نوش کے بیچنے کا انتظام کیا۔

یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے اس زمانے میں شہر احمد آباد کے اندر اس صفائی اور سلیقہ کی یہ پہلی دکان تھی جس میں گاہکوں کو بیٹھکر آرام و راحت سے کھانے کے لئے میز کرسی کا انتظام کیا گیا ہو۔ اور دوکانوں پر گاہکوں کے بیٹھنے تک کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ لوگ زمین پر غلیظ مقام پر بیٹھکر ربڑی اور سری کھنڈ وغیرہ کھاتے تھے جس سے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ یہ دکانیں تنگ و تاریک، غلیظ اور بے سلیقہ تھیں، لوگ ضرورت سے مجبور ہو کر اُن دکانوں پر جاتے تھے۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ دکانوں میں غلاظت کی شدت سے چار جانب بدبو پھیلی ہوی۔ غلیظ اور گھنونے تختوں پر بیٹھے ہوئے گاہک منہ بنا بنا کر کھا رہے ہیں قریب ہی چھوٹے چھوٹے میلے کچیلے چراغ جل رہے ہیں جس کے

دھوپ سے دکان کی کوٹھری بھری ہوئی ہے اور گاہکوں کی آنکھوں میں یہ دھواں لگ لگ کر اشک باری پر مجبور کر رہا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ درحقیقت اس کا باعث ہوا کہ میں یہی کام باقاعدگی۔ سلیقے اور تہذیب سے کروں مجھے اس کی گنجائش یہاں نظر آئی۔

دوکان کا پہلا دن؟ میں نے اس دکان پر پورے ساٹھ روپے صرف کئے اور اب میرے پاس ایک پائی بھی نہیں رہی۔ میرے پاس کوئی نوکر تو تھا نہیں دکان آراستہ کر کے میں تنہا بیٹھا سڑک کی جانب ٹکٹکی لگائے ہوئے گاہکوں کی راہ دیکھنے لگا۔ تمام دن گزر کر شام ہونے کو آئی مگر ایک بھی گاہک نہیں آیا۔ اب میری پریشانی برابر بڑھنے لگی۔ طرح طرح کے خیالات آ آ کر ستانے لگے کہ یہ تمام سامان خراب ہو جائے گا پاس ایک پیسہ بھی نہیں کل کے لئے دوکان میں سامان کس طرح مہیا ہو سکیگا۔ اگر آج کچھ فروخت ہو جاتا تو انھیں پیسوں سے کل کا سامان کیا جاتا۔ مگر تمام دن اور اتنی رات گزرنے کے باوجود کچھ بکری نہیں ہوئی۔ اس الجھن میں تھا کہ یکایک آٹھ دس آدمیوں کی ایک جماعت اس نئے سلیقے کی نئی دکان دیکھنے کے لئے اندر آئی۔ یہ لوگ دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اور چائے چبینہ تقریباً ڈیڑھ روپیہ کا خرید۔ اب مجھے کچھ اطمینان ہوا کیونکہ اتنے پیسے آگئے تھے کہ کل دکان لگائی جا سکتی تھی۔

پھر اس کے بعد یہ فکر کبھی نہیں کرنی پڑی۔ یوماً فیوماً دکان ترقی

کرنے لگی۔ اور گاہکوں کی آمد میں اضافہ ہونے لگا۔

کانگریس ۱۹۰۲ء کا اجلاس

اس سال احمد آباد میں عظیم الشان پیمانے پر انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس سر سریندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں ہوا۔ ہندوستان کے چوٹی کے رہبران قوم اور مختلف جماعتوں کے نمایندوں نے بکثرت شرکت کی۔ مصنوعات ملکی کا افتتاح بھی سرمیت سیاجی راؤ گائیکوار کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔ مشہور و ممتاز لیڈروں میں فیروز شاہ مہتا۔ ستیندر سنہا۔ (لارڈ سنہا) چنتامنی۔ سوبیرم مینا آبیٹر چینداور کر کی پرجوش تقریریں ہوئیں۔ میں نے ان تقریروں کو سنا۔ ملک کی اجتماعی وانفرادی آزادی کا جو خیال میرے دل میں پہلے سے روشن تھا اُس کی روشنی میں اُن حضرات کے لکچروں نے اور زیادہ اضافہ کیا۔ جناب تلک جی مہاراج بھی تشریف لائے تھے۔ مگر انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی۔

مجھے اس موقع پر کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں کے باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے لیے چائے، کافی دودھ وغیرہ کا کنٹراکٹ (ٹھیکہ) دے دیا تھا۔

میں نے اس کانگریس میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ رہنمایان قوم و ملک کی تقریریں سنی اور ان تقریروں کے اثر سے میرا دل پرجوش اور دماغ منور ہوا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری رگ رگ میں قوت،

جرأت اور دھن کے لئے قربانی کرنے کی روح رواں کردی گئی ہے
مجھے اس وقت اس کا علم نہیں تھا کہ مجھ پر بھی ایک ایسا دور گزرنے
والا ہے۔ جب مجھے بھی ان لوگوں کی طرح تقریر و خطابت حتیٰ کہ جیل
اور تختہ دار سے سابقہ کرنا پڑیگا۔ کس کو معلوم کہ اسے زندگی میں کیا
بننا ہے اور اس سے آیندہ چلکر قدرت کیا کیا کام لینے والی ہے اشوا جی
کلائو۔ اور ایسی ہی دنیا کی دوسری نامور ہستیوں کے ماں باپ نہیں جانتے
تھے کہ اُن کے یہ فرزند بعد کو کیا کچھ ہونے والے ہیں؟

قدرت کی فیاضیاں

قدرت کی فیاضیاں عام ہیں اُس نے تمام قسم کے ملکات انسان کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں۔ ہر قسم کی قوتیں انسان کی فطرت میں موجود ہیں جن کا اندازہ کرنا ہر وقت اور ہر شخص کے لئے ممکن نہیں جس خوش قسمت نے اپنی مخفی طاقتوں کا اندازہ لگا کر اُن سے کام لینا شروع کیا وہ شخص اپنے دور کا ممتاز فرد ثابت ہوا۔

ہمارے ملک کے نوجوانوں کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے کو پہچانیں اپنی مستود قوتوں کا جائزہ لیں اور جو کمالات اُن کے پردہ وجود میں روپوش ہیں ان کو بے نقاب کریں۔

ملک کے مشہور فیلسوف شاعر علامہ اقبال کا مطالعہ ہر قوم کے نوجوانوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ اس لئے میں ہندوستان کے جوان فکر و نظر اصحاب کو اُس کے مطالعہ کی جانب متوجہ کرتا ہوں۔

احمد آباد کی دوکان یہ دوکان ایک ماہ کے اندر ہی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی خریداروں کا ہجوم افزا رہنے لگا۔ اب تک میں تنہا کام کر رہا تھا۔ باورچی، چائے پز، برتن مانجنے والا۔ جھاڑو دینے والا۔ گاہکوں کو سودا دینے والا، بولئے، سیٹھ غرض سب کچھ میں تھا۔ خریداروں کی کثرت سے دکان میں جگہ کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اس لئے ایک موزوں جگہ پر زیادہ کرایے کی بڑی دکان لی گئی۔ میرے ایک بھائی پونیں میں بارہ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے۔ میں نے ان کو ترک ملازمت پر مجبور کر کے آزاد پیشہ تجارت کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس دوکان کا پورا چارج اُن کو دے دیا۔ اُن سے مجھکو بیحد مدد ملی۔ اب میرے پورے خاندان کے معاش کا مناسب اور موزوں حل اسی دکان سے ہونے لگا۔

شادی کی پیشکش اور میرا انکار ہندوستان میں شادی کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے جب میرے اعزا، واحباب نے مجھے معاش کی جانب سے کسی قدر مطمئن پایا تو مجھے شادی کرنے پر مجبور کیا۔ اُن کا مقصد تو میری مسرت اور خوشی دیکھنی تھی میرے گھر کو آباد دیکھنا تھا لیکن درحقیقت یہی تقریب میری امکانی ترقی کی راہ میں ایک دیوار بن جاتی۔ اور آئندہ سے متعلق تمام پروگرام ناکام بن کر رہ جاتا۔ شادی ہونے کے بعد اس کی پابندیاں اُس کے جھمیلے ایسے ہوتے ہیں کہ مرد اس میں پھنسکر ایک عجیب و غریب مخلوق بن جاتا ہے"

میں اُس وقت کی شادی کو بے وقت سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں نے صاف انکار کر دیا۔ اور جس لڑکی کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کوشش کر کے اُس سے اپنے بھائی کا عقد کرا دیا۔

ایک خاص باورچی

اس زمانے میں بلحاظ ضرورت میں نے دکان کے لئے ایک باورچی نوکر رکھا۔ یہ باورچی خاص تھا ایسا خاص کہ یہ میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا سبب بنا۔ اور اس کی باتوں نے میرے عزم و مقصد کی دنیا میں شدید تغیرات پیدا کئے اس کی تفصیل یہ ہے۔

یہ باورچی ایک زمانہ تک مشرقی افریقہ میں رہ چکا تھا۔ جب وہ پوریوں کے لئے آٹا یا میدہ گوندھنے کے لئے بیٹھتا یا کوئی ہانڈی پکاتا ہوتا تو مزے لے لے کر اپنے قیام افریقہ کے زمانے کے دلچسپ واقعات سنایا کرتا۔ اسی سلسلے میں اُس نے بتایا کہ وہاں دولت کمانے کے کتنے وسیع راستے ہیں یا وہاں تجارت کے لئے کتنی راہیں یا دہیں؟ وہاں حصول زر کے کیسے کیسے امکانات ہیں۔ اُس نے بتایا کہ یوگانڈا ریلوے لائین کی تعمیر کے سلسلے میں بعض لوگ کس طرح یک بارگی لکھ پتی بن گئے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ کتنی آسانی سے اچھی اچھی ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ افریقہ کے صحرائی باشندے کس طرح کچا گوشت کھاتے ہیں۔ اور وہ ننگے مادر زاد کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

وہاں شکار سے کس طرح دولت پیدا کرتے ہیں۔ غرض یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں امید افزا اور حوصلہ پرور حالات سنایا کرتا تھا یہ باتیں سن سن کر میرے

احمد آباد سے افریقہ کو روانگی

مارچ سنہ ۱۹۰۳ء

میری دکان پر ایک گجراتی جو تقریباً میرے ہم عمر تھے اکثر آکر بیٹھا کرتے ان کا نام سری جیت کمار شنکر دیسائی تھا۔ یہ بھی اس باورچی کی زبانی افریقہ کے حالات سنا کرتے تھے اور بالآخر ان کو بھی میری طرح افریقہ جانے کی دھن سمائی۔ ہم دونوں نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ دونوں یہاں سے ساتھ ہی روانہ ہوں گے اور وہاں جاکر دونوں ملکر کوئی کاروبار کریں گے۔ دیسائی صاحب موصوف کو تجارتی کاروبار کا شوق تھا اسی شوق کے تحت انہوں نے غیر ممالک کے بیوپاریوں سے بہت کچھ خط و کتابت کرنی شروع کردی تھی۔ اس لمبے سفر کی تیاریوں میں تقریباً دو ماہ صرف ہوگئے۔ بالآخر میں نے اپنی دکان اپنے بھائی کے کلیتہً حوالہ کردی۔ کہ آپ جانیں اور آپکا

کام جانے۔

مختصر یہ کہ میں اور سری جت کملا شنکر دیسائی۔ مارچ ۱۹۰۳ء کو احمد آباد سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچے۔ اور افریقہ جانے والے جہاز پر سوار ہو گئے بارہ روز کی سمندری مسافت طے کر کے ہم لوگ بندرگاہ "بمباسہ" پر اترے۔

یہاں ہندوستانی تاجروں کی کافی آبادی ہے یہاں کے بیوپاری زیادہ تر بھاٹیے۔ لوہرے، اور خوجے ہی نظر آئے۔ جن کے کاروبار اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔ اور جو ہر طرح خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ بمباسہ اترنے کے چند روز بعد یہ حقیقت ہم لوگوں پر منکشف ہو گئی کہ میرے باورچی نے جو آسانی سے دولت حاصل کرنے کے رنگین اور دلکش خواب دکھائے تھے اُن کی تعبیر برعکس ہے۔ یہاں بھی تحصیل دولت کے لئے ہندوستان ہی کی طرح غیر معمولی محنت، جانفشانی، اور جد وجہد کی ضرورت ہے تاہم ہم لوگوں نے اپنی ہمت کو پست نہیں ہونے دیا۔ اور اس امر کا عزم مصمم کر لیا کہ جب ترک وطن کر کے اتنی دور آئے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور کرینگے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہماری کوشش کا ثمرہ ہمکو نہ ملے۔

افریقہ

بمبئی سے افریقہ روانہ ہونے سے قبل سری جت کملا شنکر دیسائی کے تعارف سے پانچ ہزار روپیہ کے مال حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا جس

طرح میں تجارت کے اصول و آداب سے بالکل بے خبر تھا اسی طرح دیسائی صاحب بھی کاروباری علم و تجربہ سے ناواقف تھے۔ دیسائی صاحب ناگر فرقہ کے برہمن تھے اور ان کے آبا و اجداد میں سے کسی نے بھی تجارت نہیں کی تھی۔

غرض ہم دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ حقیقت بارہا میرے مشاہدے میں آچکی ہے کہ جو لوگ تجارت کے آئین و اصول سے واقف نہیں ہوتے اگر ان کو ایک بار کثیر رقم دے دیجائے تو اکثر وہ رقم بجائے منفعت بخش ثابت ہونے کے ناتجربہ کاری کی نذر ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بمباسہ کی زندگی، مسٹر موہن لال گاندھی سے ملاقات

ہم بمبئی سے روانہ ہو کر بمباسہ پہونچے۔ یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر کر اپنے کاروبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یہاں ایک نہایت اچھے انسان یعنے مسٹر موہن لال گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب پہلے ایک ہندوستانی تجارتی فرم میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کی گاڑھی کمائی سے کچھ رقم اس لئے جمع کی تھی کہ وہ ولایت جاکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کریں گے۔ چنانچہ وہ ولایت گئے، مگر وہ جمع کی ہوئی رقم کافی نہ ہوئی۔ اور مجبوراً تعلیم

ادھوری چھوڑ کر واپس آ گئے۔ ولایت سے واپس ہونے کے بعد انہوں نے یوگنڈہ کے ایک مشہور مقام اینٹیبے نامی میں ایک دوکان رکھی۔

مسٹر موہن لال گاندھی سے ملاقات کی صورت یہ ہوئی کہ جب ہمیں اپنے کاروبار میں دشواری محسوس ہوئی تو ہم نے یہ خیال کیا کہ مسٹر گاندھی ایک لائق و فائق تجربہ کار آدمی ہیں وہ یہاں کے حالات سے بخوبی واقف اور یہاں کے تجارتی رازوں سے باخبر ہیں اُن سے چلکر ملاقات کرنی چاہئے اُن کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور اگر وہ اپنی دوکان کے لئے ہمکو کچھ آرڈر دیں تو ہم اوس کی تعمیل کریں۔ چنانچہ ہم اُن سے ملے مختلف عنوانات پر گفتگو ہوئی۔ اور انھوں نے بہت مفید باتیں بتائیں اس کے ساتھ ہی انھوں نے کچھ آرڈر بھی دیا۔

ہم نے اُس آرڈر کے مطابق اپنے بمبئی کے آڑھتیا سے مال طلب کیا۔ یہاں ایک بات خاص طور پر بیان کرنی ہے۔ وہ یہ کہ اس قسم کی تجارت میں ایک تجربہ کار تاجر کو کسی دوکاندار کا آرڈر لینے اور بمبئی کے آڑھتیا سے مال طلب کرنے سے قبل یہ ضرور دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم جس کے لئے بمبئی سے اپنی ذمہ داری پر مال طلب کر رہے ہیں وہ کس قدر اعتماد تاجرانہ رکھتا ہے؟ بازار میں اوس کی ساکھ کیسی ہے۔ اوس کی مالی حیثیت کیا ہے اوس کی موجودہ تجارتی پونجی کس حد تک ہے۔ اور یہ اس لئے کہ جو مال بمبئی سے منگایا گیا ہے۔ اگر وہ بالفرض فروخت نہ ہو تو کیا اوس کی قیمت اسکی دکان یا فرم سے وصول کی جاسکتی ہے۔ یا نہیں؟ اس کے ساتھ ہی یہ

بھی غور کرنا پڑتا ہے کہ اگر آرڈر دینے والا تاجر بمبئی سے آئے ہوئے مال کی نقد قیمت ادا نہ کر سکا تو کیا یہ مال اس مقام پر پانچ دس فیصدی کم ہی پر سہی فروخت ہو جائے گا یا نہیں۔؟

ہم نے موہن لال گاندھی سے آرڈر لے کر بمبئی کے آڑھتیا سے اُن کے لئے مال تو طلب کر لیا لیکن مذکورہ بالا باتوں پر ناتجربہ کاری کی بناء پر ذرا بھی غور نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بمبئی سے جیسے مال آیا۔ یہاں اُس مال کی قیمت گھٹ گئی اور مستقبل قریب میں اُس کی کوئی اُمید بھی نہیں کہ پھر اس مال کی قیمت حسب سابق بڑھ جائے۔ اور کم از کم دام ہی وصول ہو جائیں۔ گاندھی جی نہایت ہی ایماندار، اور خوش معاملہ آدمی تھے۔ انہوں نے اس مال کی کچھ رقم جو اُس وقت اُن سے کسی طرح بھی ادا کی جا سکی ادا کی لیکن پھر بھی ایک بڑی رقم وہ ادا نہ کر سکے۔ ادھر بمبئی کے آڑھتیا نے مال کی قیمت کے لئے تقاضے شروع کئے اور وہ تقاضے تلخ سے تلخ تر ہوتے گئے۔ یہ رقم کس طرح ادا ہوئی اور کیونکر اس پھندے سے رہائی ہوئی اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

میرا مضحکہ انگیز سفر مگر حقیقت ہے کہ میری ناتجربہ کاری اور موہن لال گاندھی کے متعلق میری یہ غلط فہمی کہ وہ ایک ایماندار اور بینک، اور با اصول آدمی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تجارت کے باب میں بھی کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ میرے لئے بڑی ہی ہمت شکن ثابت ہوئی۔

اس ناکامی نے میرے خیالات پراگندہ کر دیئے تھے۔ اور میں اس حماقت کی تلافی اور آیندہ زندگی کے لئے کسی نئی راہ کی تلاش میں تھا اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وسط افریقہ میں صحاری ہالینڈ ریلوے شروع ہوئی ہے اور وہاں اس سلسلے میں مجھے کوئی نفع بخش کام مل پائے گا۔ ایک دوست کے مشورے نے میرے ارادے کو اور پختہ کر دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ روانہ ہوا اور چندی نامی بندرگاہ پر اترا جو دریائے زمبیزی (Zambesi) کے دہانے پر واقع ہے

جب میں اترا تو مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی وہ کہ جب تک کسی مسافر کے پاس کم از کم دس پونڈ نہ ہوں وہ اس بندرگاہ پر نہیں اتر سکتا اور بدقسمتی سے میرے پاس صرف آٹھ پونڈ تھے۔ میرے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ میں رات جہاز ہی پر گزاروں اور دوسرے روز روانہ ہونے والے جہاز پر پھر ممباسہ واپس جاؤں۔ چنانچہ مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ اور اس طرح یہ مضحکہ خیز سفر بھی میری روداد جہاں پیمائی میں شامل ہوا۔

فرانسیسی بندرگاہوں سے گزر

واپسی میں جزیرہ مڈغاسکر کے دو مشہور بندرگاہ تمبنے اور مجنگا بھی دیکھنے میں آئے۔ جو اس وقت حکومت فرانس کے قبضہ میں تھے یہاں یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ فرانسیسی لوگ ہندوستانیوں کے ساتھ انسانیت، مساوات، اور خلوص کا سلوک کرتے ہیں اور ان کو ممباسہ کی

کی طرح ذلیل، حقیر اور قابل نفرت نہیں سمجھتے۔ یہاں کے ہوٹل ہندوستانیوں کے لئے بھی ویسے ہی کھلے ہوئے تھے۔ جیسے فرانسیسیوں کے لئے۔

ان ہوٹلوں میں ایک ہندوستانی اُسی آزادی اور عزت کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ شراب اور اپنے دیگر تفریحی مشاغل انجام دے سکتا تھا، جیسے خود فرانسیسی لوگ۔ برخلاف اس کے بمباسہ کے کسی ہوٹل میں کوئی معزز سے معزز ہندوستانی قیام تک نہیں کر سکتا تھا۔ گو ہمارے ہندوستان میں بھی چھوت چھات کی وبا عام ہے۔ مگر مجھے اس کا احساس بمباسہ کے ہوٹلوں اور وہاں کے لوگوں کے خیالات و عمل کو دیکھکر ہوا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستان میں اس اخلاقی بیماری کو دور کرنے کے لئے ہمارے لیڈروں اور قومی رہنماؤں نے کمر ہمت نہیں باندی۔ مہاتما گاندھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے چھوت چھات کے خلاف بر زور آواز اٹھائی اور انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ انسانیت کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی نہیں کہ وہ انسانیت سے نفرت اور کراہیت کرے غالباً مہاتما گاندھی کو یہ سبق جنوبی افریقہ کے قیام ہی نے دیا جہاں خود انکو ایک کمترین اچھوت کی طرح زندگی کے دن کاٹنے پڑے تھے۔

اچھوت کے خلاف مہم ہمارے رہنمایان نے قوم کے دل و دماغ پر کبھی اس حقیقت نے عکس افگنی نہیں کی کہ وہ اچھوت کی لعنت کے خلاف کوئی موثر اقدام کریں اور اُسے ہمارے ملک ہندوستان سے نیست و نابود کر دیں۔ ہماری قومیت ہماری

انسانیت اس سے کس درجہ معیوب و مجروح ہو گئی ہے اس کا احساس ہمکو جب ہوتا ہے جب ہمارے سامنے دوسرے ممالک اور منطقوں کی آبادیاں آتی ہیں۔

صرف ایک اچھوت ہی کا مسئلہ ایسا ہے جس نے ہمارے ملک کو ترقی اور روشنی سے محروم کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے تمام لیڈروں میں صرف مہاتما گاندھی کا وہ مقدس وجود ہے جس نے اس راز کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور انہوں نے "ہریجن تحریک" کا آغاز کیا۔ اور اُن سے جس قدر ہو سکتا تھا انہوں نے "اونچ نیچ" کے انسانیت کش فرق کو مٹانے کی کوشش کی۔

ہندوستان میں ہندوؤں کے علاوہ ایک اور بڑی قوم بھی بستی ہے ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت یعنی مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک مستقل مذہب مستقل تہذیب اور مستقل قومیت کے مالک ہیں مگر ان میں اونچ نیچ کا یہ فرق نہیں پایا جاتا۔

ان کی مسجدیں، اُن کی عیدگاہیں اُن کی حج کی عبادت گاہیں یہ سب شہادت دیتی ہیں کہ ان کے یہاں، انسانیت کی تفریق نہیں سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے ہیں سب ایک ساتھ حج ادا کرتے ہیں اور کبھی اُن کو یہ تصور نہیں گزرتا کہ ہم میں کون اونچ نیچ ہے برخلاف اس کے ہمارے

یہاں ہر طبقہ کے مندر اور عبادت کدے جدا جدا ہیں۔۔ اور ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنے مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ ہمیں اور دوسری اچھی باتوں کی طرح اس خصوص میں بھی اسلام کی تعلیمات سے روشنی حاصل کرنے میں مطلق تعصب سے کام نہ لینا چاہئے۔

زنجبار۔۹ مجھے چندی بندرگاہ کو آتے اور جاتے وقت قدرے زنجبار میں بھی ٹھیرنا پڑا تھا۔ یہ مقام مشرقی افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور ہندوستانی تاجروں کی بہت بڑی تجارتی منڈی ہے۔ اس مقام سے کچھ بھاٹیا لوگ پانچ صدیوں سے زیادہ مدت سے تعلق رکھتے ہیں اور انکے ایک زمانے میں کاروبار یہاں کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔

مشہور و معروف سیاح واسکوڈی گاما" جب جنوبی افریقہ کا چکر لگا کر زنجبار آیا ہے تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اوس نے کانا" نامی ایک گجراتی جہازراں ہی کو اپنا رہنما بنایا اور اُس کی رہبری میں اُس نے اپنے سفر کا ایک معتد بہ حصہ طے کیا۔ یہاں اس وقت بھی خوجوں کی کافی آبادی ہے۔ یہ لوگ اب تک اپنے گھروں میں سواحلی زبان ہی بولتے ہیں۔ خوجوں کے علاوہ بوہرے لوگ بھی ایک مدت دراز سے یہاں مقیم ہیں۔

۱۸۸۵ء تک یہاں کے درآمد و برآمد کا تمام تر تعلق بھاٹیا لوگوں سے

تھا۔ یہ بھاٹیا لوگ یہاں پر کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے یہاں تک کہ "شاہ زنجبار" کی ساہوکاری بھی یہی لوگ کرتے تھے۔ اور محکمہ کروڑ گیری کی اجارہ داری بھی انہیں کے سپرد تھی۔

(۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۵ء) میں مشرقی افریقہ کا دس میل طویل ساحل جرمن اور برٹش دونوں حکومتوں نے سلطان زنجبار سے ۹۹ سال کے پٹہ پر لیا تھا۔ اور اس حاصل کردہ علاقے کی حکومت کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد جب انگریزی سرکار کو اس علاقے کی آبادی کا خیال پیدا ہوا تو اس نے ممباسہ سے وکٹوریہ نیانزہ تک ایک ریلوے تعمیر کی۔ اور جرمن حکومت نے بھی اس قسم کی ایک ریلوے کی بنیاد رکھی ان دونوں لائنوں کی وجہ سے قدرتی طور پر آمد و رفت کے معقول اسباب پیدا ہوئے۔ آبادیاں پیدا ہوئیں۔ تجارتی چہل پہل شروع ہوئی اور ان تجارتی ہنگاموں، اور کاروباری سرگرمیوں میں مسلمان کھوجوں اور بوہروں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ بھاٹیا اور دوسری ہندو قوموں نے اپنی مذہبی قیود اور پابندیوں کی وجہ سے اس میں کوئی لائق بیان حصہ نہیں لیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہندو قومیں وہاں کاروباری حیثیت سے صفر کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ اور ان کا تجارتی وقار بالکل ختم ہو چکا ہے۔ کاش ہندو قوم اپنی ان کمزوریوں کا بر محل احساس کرتی!

موہن لال گاندھی کیلئے اینٹبے (Entebbe)

میں ممباسہ پہونچنے کے بعد بقیہ رقم کی وصولی کے لئے موہن لال گاندھی کی ملاقات کی غرض اسے اینٹبے کو روانہ ہوا۔ یہ مقام یوگانڈہ سٹیٹ کا دارالحکومت ہونے کے سبب بہت ہی معروف و مشہور تھا۔ گو اس وقت ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ دس پانچ ہندوستانیوں کی دکانیں اور چند ملازم پیشہ لوگوں کے مکانات بس اس گاؤں کی کل یہی کائنات تھی۔ چنانچہ یوگانڈہ ریلوے پر سوار ہوکر پہلے کیسومو گاؤں پر ٹھہرا۔ اور پھر یہاں سے وکٹوریہ نیانزہ میں یوگانڈہ ریلوے کے جہاز پر سوار ہوکر روانہ ہوا۔

چونکہ اس جھیل میں جابجا جزیرے اور سنگیں چٹانیں تھیں اس لئے یہ یہ قاعدہ تھا کہ دن میں جہاز رانی ہوتی تھی اور رات کو کسی جزیرے میں لنگر ڈالدیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارا جہاز بھی رات گزارنے کے لئے ایک مقام پر ٹھہر گیا اور رات گزار کر علی الصبح روانہ ہوا۔ یہ جہاز اسی روز دوپہر اینٹبے پہونچ گیا۔

یہاں موہن لال گاندھی سے ملاقات ہوئی ان کی دوکان اور دوکان کی مالیت دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ رقمی مطالبہ ابھی کئی سال تک نہیں ہوسکتا اور اس ادائی میں گاندھی صاحب مجبور ہیں۔

موہن لال گاندھی کے ایماندار ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن

کاروبار میں اس قسم کی مجبوریات بعض وقت ناگزیر ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے بمبئی کے آڑھتیا" نے ہمارے متعلق بدترین خیال قائم کیا ہوگا۔ اور وہ یہ سمجھا ہوگا کہ میں نے عمداً اُسے نقصان پہونچایا۔ حالانکہ نہ گاندھی صاحب کی نیت مجھے نقصان پہونچانے کی تھی اور نہ میرا تصور تھا کہ میں اپنے آڑھتیا کو نقصان پہونچاؤں۔ میں نے یہاں کے جملہ حالات کی اطلاع دیسائی صاحب کو کر دی۔ اور اپنی پیچ در پیچ پریشانیوں سے اُن کو اطلاع کر دیا۔

میری ملازمت۔ میں کاروباری ناکامیوں کی بدولت بہت بدل ہو گیا تھا۔ اور چاروں جانب سے نت نئی دشواریوں میں پھنس کر حیران تھا کیا کروں۔ بالآخر اپنے ضمیر اور مقصدِ زندگی کے خلاف اس پر مجبور ہو گیا کہ سردست وقت گزارنے کے لئے پھر کوئی ملازمت ہی کر لوں۔ اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے وہاں کے نائب خزانہ دار صاحب سے ملاقات کی اور اُن سے اپنا مدعا عرض کیا۔ انہوں نے مسٹر اے۔ ڈی سوزا نامی سینیر صیغہ دار سے مجھ کو ملایا مسٹر موصوف نے مجھے حسابی تختہ جات کی نقل کا کام دیا۔ اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ

"یہ نقول فارن آفس (لنڈن) کو روانہ کی جائے گی لہذا نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرنا ہے"

مجھے اس سے قبل انگریزی میں کام کرنے کا کوئی خاص موقعہ نہیں ملا تھا کیونکہ امریلی میں جب میں ملازم تھا تو وہاں تمام کام گجراتی زبان

میں کرنا پڑتا تھا۔ نقل کا کام گو دشوار نہ سہی مگر یہ خیال کہ میری تحریر اتنے بڑے دفتر میں جائے گی، اگر مجھے ذرا بھی فروگزاشت ہوگئی تو بڑا غضب ہوگا۔ اس قسم کی خیالی کمزوری نے میرے دل و دماغ پر اچھی طرح غلبہ حاصل کرلیا اور میری قوت کردار جواب دینے لگی۔

ڈی سوزا صاحب نے تختہ جات ایک موٹا بلندہ اور بہت سے مطبوعہ فارم بھی رکھ دیئے تھے۔ میں نے پہلے ایک ایسا تختہ منتخب کیا جس میں جمع و خرچ کی مدات کی صرف یک سطری تحریر تھی۔ مگر میری مرعوبیت نے مجھے کچھ ایسا مہمل سا بنا دیا تھا کہ اسی ایک تختہ کی نقل میں سارا دن لگ گیا۔ اور تقریباً ۱۶ تختے خراب کئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ کسی نے میری کارکردگی کی جانب توجہ نہیں کی ورنہ میرا یہ کام ایسا تھا کہ مجھے پہلے ہی روز ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا۔ دوسرے روز قدرتی طور پر فارن آفس کی ہیبت میرے دل سے خودبخود کم۔ اور اس کے بعد سے کام کی رفتار میں تدریجاً تیزی پیدا ہونے لگی۔ اور کچھ دنوں میں پوری دلیری اور مہارت پیدا ہوگئی اس کے ساتھ ہی ساتھ میرے لئے ایک دشواری اور بھی تھی اور یہ کہ انگریزی حکام سے انگریزی میں بات کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ مجھے پہلے سے عادت نہ تھی اس لئے اکثر ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر کچھ دنوں کے بات یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ میں آسانی سے ان کی بات سمجھنے لگا۔ اور روانی کے ساتھ اُن سے باتیں کرنے لگا۔

اللہ اللہ کرکے مہینہ ختم ہوا۔ گو میں نے ملازمت کے لئے کوئی تحریری درخواست

پیش نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی سورہ پیہ ماہوار کے حساب سے مجھے تنخواہ دی گئی جو یہاں اہلکاروں کی ابتدائی یافت ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں، یوگانڈا اسٹیٹ کی ملازمت پر فائز ہوں۔

یہاں کے سرکاری ملازمین میں اکثر غالب حصہ گوانیز کا تھا۔ چنانچہ دفتر خزانہ جس میں مجھے ملازمت کرنی پڑی تھی اس کے ہیڈ کلرک اور دیگر سنیر اہلکار بھی اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان میں باہم کچھ ایسا ارتباط تھا کہ دوسری کسی قوم کے انسان کو بآسانی ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اینٹبے سے جزیرہ بگایا کو.....! اس دفتر کی مختلف شاخوں میں ۶ ماہ کام کرنے کے بعد میرا تبادلہ اینٹبے سے جزیرہ بوگایا۔ کو ہوا۔ اس مقام کے متعلق کسی قدر تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

"بوگایا" وکٹوریہ نیانزہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ بیس ہزار مربع میل ہے۔ جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرہ بھی ہیں۔ جس میں ملکی ہی لوگ بھی اکثریت کے ساتھ آباد ہیں۔ ان میں پچاس فیصد اشخاص ایک عجیب بیماری میں مبتلا تھے جس کا نام سلیپنگ سکنس (Sleeping Sickness) تھا۔ یہ مرض بہت ہی مہلک ہوا کرتا ہے۔ یہ مرض آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے۔ مریض کمزور ہوتے ہوتے سال دو سال میں ختم ہوتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو اس جان لیوا بیماری میں مبتلا ہو کر صحت یاب ہوا ہو۔ مجھے ایسے افراد

جو گھریٹی وغیرہ دینے سے مجبور تھے ایک ماہ تک بیگار پر کام لینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ مزدور لکڑی چیرنے کا کام کرتے تھے۔۔ ان میں ہر شخص نہایت ہی کمزور و نحیف نظر آتا تھا۔ اور بہت سے تو مذکورہ خطرناک مرض میں مبتلا بھی تھے۔ یہاں کے لوگ چہرہ دیکھ کر پہچان جاتے تھے کہ یہ سلیپنگ سکنس میں مبتلا ہے۔

یوگاندا بھی ایک چھوٹا سا مقام تھا۔ دس بیس جھونپڑوں پر اس کی آبادی مشتمل تھی۔ میرے قیام پر بھی ایک جھونپڑا جھیل کے کنارے تیار کیا گیا تھا۔ جو یہاں کی اصلی آبادی سے دو ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

کبوکو۔ مگرمچھ ۔ اس جھیل ہی پر کچھ موقوف نہیں ہے بلکہ افریقہ کے تقریباً تمام دریاؤں میں مگرمچھ اور دوسرے آبی جانور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان آبی جانوروں میں خطرناک جانور دریائی گھوڑا (Hippopotamus) ہے جسے یہاں کے لوگ کبوکو سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جانور دن بھر پانی میں رہتا ہے مگر رات کے وقت گھاس چرنے کے لئے کنارے کے خشک حصوں میں آیا کرتا ہے یہ جانور بڑا غضبناک ہے اسے جب غصہ آتا ہے تو سطح آب پر چلتی ہوئی کشتیوں کو الٹ کر غرق کر دیتا ہے۔ اور اکثر گینڈے کے سینگ جیسے تیز دانتوں سے کشتیوں میں سوراخ کر دیا کرتا ہے۔ یہ جانور گینڈے سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس کے دو سپید سے اور دو نصف دائرے کی طرح دانت ہوتے ہیں۔ یہ پانی میں رہتے ہوئے بہت ہی دلیر اور بےخوف

ہوتا ہے مگر جب خشکی پر آتا ہے تو اکثر کسی آنے جانے والے انسان کے پاؤں کی آہٹ ہی اُسے فراری پر مجبور کر دیا کرتی ہے جب رات کو تاریکی ہو جاتی ہے تو کیوکو کے غول کے غول میری جھونپڑی کے اطراف میں چرنے کے لئے آیا کرتے۔ ابتدا میں جب مجھے واقعی علم نہ تھا میں اُن سے بہت خوفزدہ رہتا اور میرا ملازم بھی ڈرا کرتا ہم لوگ انکے اوقات میں گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب کشتی میں بیٹھکر سیر دریا کی غرض سے نکلتے تو کیوکو کے سر پانی کی چادر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے مگر یہاں کے ملاح بھی کافی ہوشیار ہیں۔ وہ ایسے اوقات میں ایک خاص آواز نکالتے جس سے وہ کیوکو پانی میں ڈوب کر گم ہو جاتے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اُن کے سر بہت فاصلے پر نکلتے ہوئے نظر آتے۔

کیوکو کے علاوہ یہاں مگرمچھ بھی کافی موذی ہوتے تھے۔ اکثر انسانی جانیں ان کے سبب سے بھی ضائع ہوا کرتی تھیں ان کے خوف سے گھٹنے برابر پانی میں جانا بھی اندیشہ سے خالی نہیں تھا۔ یہ اکثر دریاؤں اور جھیلوں سے نکلکر ملحقہ نالوں میں بھی آجاتے تھے۔ یہاں کی عورتیں چھوٹے چھوٹے نالوں سے پانی بھرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتیں کہ ایک لمبی لکڑی میں برتن باندھ کر بہت فاصلہ سے پانی حاصل کیا کرتی کیونکہ ان کو اُس مقام پر بھی مگرمچھ کا خوف رہا کرتا تھا

مگرمچھ کے انڈے اور سرہیری جانسٹن — ؟

حکومت انگریزی کے کلونیل آفس کی جانب سے سرہیری جانسٹن کو یوگانڈا کی ہائی کمشنری پر بھیجا گیا تاکہ وہ یہاں کے مقامی حکومت کا انگریزی اقتدار اعلٰے کے منشا کے مطابق انتظام کریں۔ چنانچہ انہوں نے انٹبے کو ہی دارالسلطنت قرار دیا مگر ان کو عام صحرائی اور دریائی جانوروں خصوصاً مگرمچھ اور کیبوکو کی کثرت سے بہت تشویش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مگرمچھ کے انڈے جہاں جہاں سے مل سکیں حاصل کرکے انھیں ضائع کیا جائے تاکہ اس خطرناک جانور کی آئیندہ کے لئے نسل ہی مسدود ہو جائے۔ یا اس میں معتدبہ کمی ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کے احکام نافذ کئے کہ مگرمچھ کے انڈے جسقدر مل سکیں حاصل کرکے اور توڑ کر زمین میں دفن کئے جائیں پھر کیا تھا اطراف سے بکثرت انڈے آتے ان کو مقامی حکومت خرید کرتی اور دفن کراتی۔ لوگوں کو یہ نیا مشغلہ ہاتھ آیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں انڈے روزانہ آتے یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا مگر انڈوں کی درآمد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بالآخر حکومت کو مجبور ہو کر یہ خیال ہی ترک کرنا پڑا۔ کہ مگرمچھوں کی کمی ممکن نہیں۔ اس علاقے میں مگرمچھ اور دریائی گھوڑے (کیبوکو) اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ شکاری انکے شکار کرنے کو کارتوس کا ضائع کردینا سمجھتے تھے۔

دو حادثے ......؟

قیام بنگالیا کہ زمانے میں مجھے دو ایسے ہولناک حادثے پیش آرہے کہ اگر قدرت کارسازی نہ فرماتی تو میں یقیناً مرچکا ہوتا۔ اون میں سے ایک حادثہ "دریائی" کہ میں ڈوبنے ڈوبتے بچا اور دوسرا حادثہ "سانپ" کا ہے ان دونوں ہولناک حادثات کی قدرے تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی

خونی لہروں کے منہ سے نکلنا

ایک روز میں ساحل دریا کے کنارے تنہا سیر کر رہا تھا کوئی ماہی گیر ایک چھوٹی سی کشتی کنارے پر باندھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ ایسی کشتی بہت ہی ہلکی پھلکی ہوا کرتی ہے جسے مشاق چلانے والا ہی چلا سکتا ہے۔ اور اس کے چلانے میں توازن کو قائم رکھنا خاص بات ہے ورنہ یہ خیال کہ چھوٹی سی تو کشتی ہے اس کے چلانے میں کیا دشواری ہوگی درحقیقت خطرناک غلط فہمی ہے۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوا۔ میں نے کشتی کھولی اور سیر دریا کے ضبط نے مجھے اس کے چلانے پر مجبور کیا۔ میں اسے کھینتے کھینتے کنارے سے بہت دور نکل گیا۔ مجھے چونکہ پہلے سے کشتی رانی کا کوئی تجربہ نہ تھا میں اپنا توازن قایم نہ رکھ سکا کشتی الٹ گئی اور میں پانی میں گر گیا

میں نے اندازہ کیا تھا کہ کشتی پانی کی تہ تک پہونچ گئی ہوگی مگر واقعہ یہ تھا کہ کشتی اتنی ہلکی تھی کہ وہ پانی ہی پر تیرتی رہی۔

میں اونی سوٹ میں تھا۔ پاؤں میں وزنی بوٹ تھا۔ تیرتے وقت مجھے اس کا بیحد خوف تھا کہ کہیں مگرمچھ کا لقمہ نہ بن جاؤں۔

میں اسی دہشت میں چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں کوئی دریائی جانور تو نہیں ہے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے اطراف میں کہیں کسی جانور کے ہونے کے آثار نظر نہیں آئے پھر بھی دہشت بدستور تھی۔ میں برابر تیرتا ہی جاتا تھا۔ مگر ابھی کنارہ کوئی ۲۵ فٹ کے فاصلہ پر تھا کہ میرا دم پھولنے لگا اور میرے ہاتھ پاؤں نے یکایک جواب دے دیا۔ بالآخر میں نے یہ سمجھ لیا کہ میری زندگی کی آخری سانسیں ہیں اور میری نگاہوں کو جو کچھ اس وقت نظر آرہا تھا وہ دنیا کا آخری منظر ہے میں اس وقت بالکل بے حس و حرکت تھا اور اپنے کو موجوں کی نذر کر چکا تھا کہ یکایک یہ محسوس ہوا کہ میرے پاؤں کسی سخت اور ٹھوس چیز سے مس ہو رہے ہیں غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ زمین ہے اور مجھے فضل خدا و ندی کی لہروں نے کنارے پر پہونچا دیا اب میرے سامنے خشکی کا منظر تھا۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میرا دل اعتراف کر رہا تھا کہ قدرت کی کرم فرمائیوں نے مجھے خونی لہروں کے منہ سے نکال کر ساحل مراد تک پہونچایا ورنہ غرق دریا ہونے میں ذرا بھی کسر باقی نہیں رہی تھی۔

سانپ کا مقابلہ - دوسرا واقعہ سانپ سے متعلق ہے۔ میں ایک شب کو تقریباً ۸ بجے قندیل لے کر قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء گیا۔ یہ بیت الخلاء کوئی چار مربع فیٹ کی ایک کوٹھری تھی جس کا دروازہ عرض میں ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ میں اندر بیٹھا ہی تھا کہ یکایک ایک بڑا کالا سانپ زبان کبھی کو اندر

اور کبھی باہر کرتا ہوا دروازے سے نکل کر میری جانب آتا ہوا نظر پڑا،
میرے پاس اُس کے شر سے بچنے اور جان بچانے کے لئے کوئی آلہ نہ تھا
صرف پانی کا ڈبہ اور ہر یکیں لالٹین میرے پاس تھی اور ظاہر ہے کہ سانپ
کے سر کچلنے کے لئے یہ دونوں چیزیں بیکار تھیں یہ خیال بھی آیا کہ پیڑوں
کی طرح ایک ہاتھ سے اس کا سر اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی دُم پکڑ کر
اسے ہلاک کرنے کی کوشش کروں۔ مگر میں ایسا بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس
کی دم بیت الخلار کی کوٹھری کے باہر تھی۔ جو کسی طرح گرفت میں نہ آسکتی
تھی۔ اس خیال کی ناکامی نے مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔

اب اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی، کہ میں اپنے آپ کو سانپ
کے رحم و کرم پر بالکل چھوڑ دوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ
کھسکتے کھسکتے بالکل قندیل کے قریب آگیا۔ اور اُس کا منہ قندیل سے لگ
گیا۔ قندیل میری داہنی جانب صرف ۱۸، ۱۹ انچ کے فاصلہ پر ہوگی اب
اُس نے قندیل کے چاروں طرف گھیرا ڈالنا شروع کیا۔ اس گھیرے میں
اُس کا منہ میرے داہنے پاؤں سے چار پانچ انچ کے فاصلہ پر رہ گیا
تھا۔ میرا کلیجہ اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کہ اب اس نے مجھے ڈسا،
اب میں موت سے دوچار ہوا۔ مگر اس موقعہ پر بھی خدا نے فضل فرمایا۔
اور وہ سانپ آہستہ آہستہ میری داہنی جانب بڑھا میرے دونوں پاؤں
کے سامنے سے ہو کر آگے کی جانب جانے لگا۔ میں نے اپنے پراگندہ حواس
درست کئے اور اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر میں نہایت ہی آہستگی کے ساتھ

کھڑا ہوا۔ اور میرے کھڑے ہونے کے بعد ہی سانپ کی رفتار اور اس کے رُخ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ برابر میری داہنی جانب جا رہا تھا مگر قندیل میں جو گھیرا اُس نے ڈالا تھا وہ ابھی تک پوری طرح نہیں کھلا تھا۔ اب میرے سامنے صرف یہی ایک صورت تھی کہ ہمت کر کے دیوار پھاند جاؤں۔ اور اس طرح اپنی جان بچاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا باہر نکلنے کے بعد، تدابیر حفاظت کے خیال وسمی کی جگہ خوف و دہشت نے لی لے۔ اب میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ تمام جسم پسینہ میں شرابور میں نے بہت چاہا کہ آواز دیکر لوگوں کو بلاؤں مگر دیر تک منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ چند لمحوں کے بعد اڑے ہوئے حواس واپس آئے۔ دل کی دھڑکن میں سکون پیدا ہونے لگا۔ منہ سے آواز نکلنی شروع ہوئی۔ میں نے لوگوں کو آواز دی۔ وہ آئے سب نے ملکر اُس مہلک اور جان لیوا سانپ کو ہلاک کر دیا۔

دریائے نیل کا منبع میں یوگا کے قیام کے زمانے میں اپنی چھوٹی کشتی میں بیٹھکر جنجا نامی بندرگاہ کی سیر کو گیا یہی قیام پر دریائے نیل کا منبع ہے۔ جو اسی جھیل وکٹوریہ نیانزہ میں نکلتا ہے۔ یہاں جھیل کا پانی تقریباً ۲۵ فٹ کی بلندی سے گر کر روان ہوتا ہے۔ اس کا نام دریائے نیل ہے۔

دو ناقابل فراموش ملاقاتیں۔ اسی جنجا میں ایک دکنی صاحب یعنی ڈاکٹر وٹھل راؤ لانڈے

سے تعارف کی عزت حاصل ہوئی جو یہاں بحیثیت سب اسسٹنٹ سرجن متعین تھے اور پھر انھیں کے ذریعہ سے ایک دکنی مسلمان محمد یوسف نامی اور اُن کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی۔

یہ دونوں ملاقاتیں ایسی مخصوص اہمیت رکھتی ہیں کہ میں انکو اپنی زندگی تک فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر لانڈے کی ملاقات اور پھر اُن سے تعلقات کے نتیجے میں یہ ہوا کہ اُن کی بھانجی سے میری شادی ہوگئی اس طرح مجھے ایک نہایت ہی مناسب و موزوں رفیقۂ حیات اور شریکۂ غم مل گئی۔

محمد یوسف اور ان کی اہلیہ کی ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے انھیں لوگوں کی بدولت پھانسی کے تختے پر لٹکنے کی نوبت آئی۔ اس واقعہ کی تفصیل اسی کتاب میں کسی مناسب موقعہ پر درج ہے۔

ڈاکٹر لانڈے ایک نہایت نیک نفس، پاک باطن، اور قوم و وطن کے سچے درد مند تھے۔ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ خدمت خلق ہی میں بسر ہوتا تھا۔ خدا نے ان کو بہت کچھ دولت دی، جسے انہوں نے نیک کاموں میں صرف کیا۔ "انہوں نے کردے زنانہ یونیورسٹی کو ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) کا فیاضانہ عطیہ دے کر مرہٹہ قوم پر ایک غیر فانی احسان کیا۔ ڈاکٹر کردے نے اس رقم سے ایک زنانہ ہائی اسکول پونہ میں قایم کیا اور اس کا نام وٹھل راگھو بالانڈے ہائی اسکول" رکھا۔

ڈاکٹر لانڈے ۱۹۱۷ء میں بلیک واٹر کے مہلک مرض میں مبتلا

ہوکر انتقال کر گئے۔۔ مگر ان کی نیکیاں اور نیکیوں کی یادگار اب تک قائم ہے۔

پھر انٹیبے میں بھگا یا میں جب میں برسر ملازمت تھا تو فطری ذوق نے پھر مجھے تجارتی کاروبار کے لئے گدگدایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں۔ میں نے، بیل بکروں کی کھالوں کی تجارت کو منتخب کیا اور ایک نوکر رکھ کر یہ بیوپار شروع کیا۔ صورت یہ تھی کہ مضافات سے مال جمع کرانا اور کشتی کے ذریعے انٹیبے کی بازار میں ان کی کھپت کرانا۔ اس کاروبار میں۔ مجھے فائدہ ہوا مگر اسے کیا کیا جائے کہ جب مال تیسری مرتبہ روانہ کیا گیا تو ملازم تمام اصل و منافع لے کر ایسا غائب ہوا کہ پھر آج تک پتہ نہ چلا۔

اس جزیرے میں مجھے ابھی چھ ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ پھر مجھے کلکٹر آفس میں ایک اہلکار کی جائنٹ سے کام کرنے کے لئے انٹیبے ہی میں بلا لیا گیا۔ چنانچہ میں حسب الحکم روانہ ہوگیا۔ اس وقت یہاں کے کلکٹر صاحب جزیرہ مالٹا کے رہنے والے مسٹر جیمس مارٹن تھے یہ صاحب کلکٹر تو تھے مگر نوشت و خواند سے بالکل نابلد۔ معلوم نہیں کتنے فاقوں میں انہوں نے (J. M.) جے۔ ام دو حروف اپنی دستخط کے لئے سیکھ لئے تھے۔ اگر گورنمنٹ کے کلکٹر کے لئے سرکاری کاغذات پر علامت ابہام یا کندہ و تراشیدہ مہر کو ثبت کرنا جائز ہوتا تو شاید مسٹر جیمس مارٹن صاحب ان دو حرفوں کے سیکھنے کی بھی زحمت نہ اٹھاتے۔

مسٹر جیمس نارٹن باوجود ان پڑھ ہونے کے بہت ہی ہوشیار اور فریس تھے۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت سے کسی نہ کسی طرح کلکٹری کی گاڑی چلا ہی لیتے تھے۔ ان کے دو یورپین مددگار بھی تھے۔ جن کی مدد سے وہ اپنے اس اہم عہدے کو نبھائے جا رہے تھے۔

اٹلے کاغذ پر دستخط میں جب ان کے پاس کاغذات دستخط کرانے کی غرض سے لیجایا کرتا تو مجھے خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا کیونکہ میں ذرا بھی غفلت کروں تو کلکٹر صاحب بجائے سیدھے کاغذ پر دستخط کرنے کے اٹلے کاغذ پر دستخط کر دیں۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا کہ انھوں نے اٹلے کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ مجھے شرمندہ ہونا پڑا کہ میں نے کیوں نہ احتیاط سے کام لیا۔ اور ہی کیوں نہ دستخط کرتے وقت یہ خیال کیا کہ صاحب کس رخ پر دستخط کر رہے ہیں۔ آپ حیرت کریں گے کہ جس شخص کو سیدھے اور اٹلے کاغذ میں تمیز تک نہ ہو اُسے گورنمنٹ نے کلکٹری کے عہدے کے لئے کیوں تجویز کیا لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ افریقہ والوں پر حکومت برطانوی کی جو نگاہ تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ اُن پر اُن کے یہاں کے ایک سخت آدمی حکومت کرے۔ جو اُن کے حالات سے بہت واقف اور وہاں ہر دلعزیز بھی ہو۔

ایک بات قابل بیان ہے وہ یہ کہ اس وقت یہاں کے اسسٹنٹ کلکٹر کی تنخواہ تین سو بارہ (۳۱۲) روپیہ ماہانہ اور کلکٹری کی ابتدائی تنخواہ پانچ سو (۵۰۰) روپیہ ماہانہ اور اہلکار کی ابتدائی یافت ایک سو

(۱۰۰ روپیہ) ہوا کرتی تھی۔ آپ غور فرمائیے کہ ہندوستان میں کلکٹر اور اہلکار کی تنخواہ میں جو تفاوت ہے اُس سے کہیں کم یہاں کے کلکٹر اور اہلکار کی تنخواہ میں ہے

جب میں یوگانڈا آیا ہوں تو اُس سے قبل یہاں چند اچھے ہندوستانی اشخاص معزز عہدوں پر متمکن تھے۔ ان میں پونہ کے مشہور ڈاکٹر دشرم رام جی کھلے کے فرزند ارجمند مسٹر مکند راؤ کھلے بھی تھے جو انیٹنے ریاست کے صیغہ فوج کے ہیڈ کلرکی پر فائز تھے۔ ان کا مشاہرہ دوسو بارہ روپیہ آٹھ آنے (۸-۲-۲۱۲) روپیہ اٹھ آنہ تھا۔ ان کا ابتدائی تقرر اسی عہدہ پر پہلے وسطا فریقہ میں براہ راست انگلینڈ سے عمل میں آیا تھا۔

نیمولے میں یہاں ابھی کام کرتے چند ماہ بمشکل گزرے تھے کہ میرا تبادلہ نیمولے کو کر دیا گیا۔ یہ مقام دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے۔ جہاں پہونچنے کے لئے (پیادہ پا) تقریباً ایک ماہ کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔

نیمولے صوبہ نیل کے صدر مقام ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر یہاں آب وہوا بیحد ضرر رساں اور دشمن صحت ہے اسی سبب سے اکثر سرکاری ملازمین کو چھ ماہ بعد بھی مجبوراً تبادلہ کرانا پڑتا ہے۔ یوگانڈہ کا پورا علاقہ ملیریا زدہ ہے مگر نیمولے خاص کر زیادہ ملیریل ہے۔"

مجھے نیموے کی خرابی آب و ہوا کا علم تھا مگر میں وہاں جانے پر بخوشی راضی ہو گیا۔ بخوشی راضی ہونے کی وجہ، آگے ظاہر ہو جائیگی

چونکہ میرا اینیٹے سے نیموے کو سفر کرنا سرکاری اغراض و احکام پر مبنی تھا۔ اس لئے میرے سفر میں سرکار کی جانب سے ہر ممکن سہولت فراہم کر دی گئی تھی۔ مگر گدہا، خچر، گھوڑا، اس سفر میں کسی طرح اور کسی قیمت پر نہیں میسر آ سکتے تھے۔ کیونکہ راستے میں زہریلی مکھیوں کی وہ کثرت ہے کہ الامان! کوئی جانور ان کی زد سے جان بچا کر نہیں گزر سکتا۔ اس لئے سفر کی زیادہ سے زیادہ دو صورتیں ہیں یا تو پیدل چلا جائے یا جھولی میں بیٹھکر یہ مسافت طے کی جائے۔ سرکار کی جانب سے مجھے ۲۰ مزدور دیئے گئے تاکہ وہ میرا سامان لاد کر پہونچائیں سرکاری ملازم ہونے کے سبب مجھے یہ سہولت بھی دی گئی کہ میں آگے بڑھکر بوٹیابا سے بجائے بری راہ کے دریائی راہ اختیار کروں اور دریائے نیل میں کشتی پر بیٹھکر یہ راستہ طے کروں اس دریائی راہ میں دو آسانیاں ہیں۔ اول تو پیدل چلنے کی صعوبت سے نجات دوسرے راستہ کا مختصر ہونا کیونکہ خشکی کا راستہ جس سے علی العموم تجار اور دوسرے عام لوگ سفر کرتے تھے خطرناک اور دشوار، ہونے کے علاوہ طویل بھی تھا۔

لوہے کی کشتی میں سفر

میں اینیٹے سے روانہ ہو کر بوٹیابا پہونچا، یہاں لوہے کی کشتی جو بادبان سے آراستہ تھی

ملی اس پر بیٹھکر میں نے دریائی سفر شروع کیا۔ یہاں سے دریائے نیل کی روانی تک پہونچنے میں تقریباً چھ گھنٹے صرف ہوئے۔ یہ سفر گو خشکی کے سفر کے مقابلے میں کم طولانی تھا لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ خاصکر ایسے اوقات میں جب نہایت فراٹے کی بے پناہ، اور غیر منظم ہواؤں کا زور ہوتا اور دریا کی خونی لہریں اُٹھ اُٹھکر کشتی کو زیر کرنے کی کوشش کرتیں، میں گو خطرات راہ کا پہلے سے کسی قدر خوگر تھا مگر پھر بھی اپنے دل میں طوفانی ہواؤں کے چلتے وقت ایک دہشت سے بھری ہوئی کیفیت محسوس کرتا اس سفر میں بعض مواقع بیحد انبساط آفریں آئے، اور سخت ہولناک منظر نگاہ کے سامنے گزرے۔ اگر بادبان کی ڈوریاں بہت ہی غیر معمولی مضبوط و مستحکم نہ ہوتیں۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کشتی الٹ کر مجھے تہہ آب نہ کر دیتی اور میں ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے نہ مٹ جاتا چلتے چلتے جب کشتی دریائے نیل کی عین روانی میں پہونچی۔ (جہاں سے دونوں جانب خشک زمین نظر آتی تھی) تو بہت ہی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

یہ دریائی راہ تیسرے روز طے پا گئی۔ اور میں اللہ اللہ کر کے نیمولے پہونچا۔

نیمولے آنے کی خوشی نیمولے گو آب و ہوا کے لحاظ سے نہایت ہی دشمن جان جگہ تھی مگر میں نے یہاں آنے میں ایک خوشی محسوس کی جیسا پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس احساس مسرت

کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے میری فطرت میں تجارت کا مذاق ودلیعت رکھا ہے اور اس مذاق کی پرورش میں نیمولے میں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ مقام ہاتھی دانت کا مرکز تھا۔ یہاں سے ملک ٹانگو کو ہاتھی دانت بکثرت جاتا تھا۔ صحرائی لوگوں کے مذاق کی چیزیں۔ رنگین کپڑے تانبے اور پیتل کے چمکدار تار رنگ برنگ کے بوت، خوبصورت آئینہ اور کلابتوں کی لیس وغیرہ اور اس قسم کی دوسری نمائش اور بھولے بھالے تمدن ناآشنا لوگوں کو مرغوب پسند آنے والی چیزیں عرب تجار براطونی سرحد سے اس علاقے میں لاتے اور ان کے تبادلے میں ہاتھی دانت لیجاتے یہاں کے صحرائی کاروباری لوگ سکہ کی قدرومنزلت سے بالکل بے بہرہ تھے، اس لئے عربوں سے اُن کی معاملت بجائے نقد رقم کے مذکور الصدر اشیاء سے ہوا کرتی تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک ایک عرب تاجر پچاس پچاس۔ سو سو۔ دو دو سو، بلکہ بسا اوقات چار چار سو مزدوروں پر مال لاد کر لاتا۔ اور دو ایک سال کے بعد انہیں مزدوروں پر ہاتھی دانت لاد کر لے جاتا۔ پہلے یہ سوداگر زنجبار اور بھاگامولو کی بندرگاہوں میں سے ہوتے ہوئے۔ خشکی کے راستے کو پیادہ پا طے کرتے ہوئے کانگو کے علاقے میں آیا کرتے تھے۔ لیکن یوگانڈا ریلوے کی تعمیر کے بعد سہولت پیدا ہوگئی۔ اور یہ تجارتی کاروبار براہ راست نیمولے سے ہونے لگا۔

تجارت مختصر یہ کہ میں نے اول اول ہاتھی دانت کی تجارت کرنی چاہی اور میرا یہ ارادہ نیمولے آنے کے وقت ہی

ہوگیا تھا مگر اس درمیان میں رام بھاؤ لوکھنڈے صاحب کو جو ملازمت کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان کو دوسرے محب وطن مرہٹوں نے اس کاروبار کے لئے مالی امداد بطور قرضہ دی۔ اور اُن کو میرے ساتھ کر دیا۔ میں جب نیمولے پہونچ گیا تو میں نے مسٹر لوکھنڈے کے لئے بازار میں ایک دوکان تعمیر کرائی۔ جس کی تیاری پر اوسے عام پسند پارچہ جات اور دیگر سامان تجارت سے مزین کیا گیا۔

رام بھاؤ لوکھنڈے کی اچانک موت

میں نے عربوں کے طرز تجارت کی پیروی کرتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ رام بھاؤ بھی مال لے کر دورہ کریں۔ چنانچہ میرے خیال و مشورہ کے مطابق ایسا ہی ہونے لگا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ہم اس تجارت میں کامیاب ہوں۔ چنانچہ بیچارے رام بھاؤ یہاں آنے کے چار ماہ بعد بلیک واٹر کے جان لیوا بخار میں (جو یہاں وبائے عام کی حیثیت رکھتا ہے) مبتلا ہوئے اور چار روز بیمار رہ کر پانچویں روز انتقال کر گئے۔ مجھے اس حادثہ سے بہت ہی سخت صدمہ ہوا۔ اول تو مسٹر رام بھاؤ لوکھنڈے کی غریب الوطنی کی موت کا غم اور پھر اوس کے بعد اس کا بھی افسوس کہ ہم نے جو کاروبار کیا تھا اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ بالآخر لوکھنڈے آنجہانی کا تمام پھیلا یا ہوا کام مجھے سمیٹنا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد مسٹر گھلے اور مسٹر جوش نے قرض کی رسیدیں مجھے واپس کر دیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس تجارت میں جس قدر رقم لگی ہے اوسے کسی

نہ کسی طرح فراہم کر کے آنجہانی کی اہلیہ کے پاس بھیج دینا چاہیئے۔ اس رقم کے انتظام کے لئے ہائی کورٹ سے مجھی کو ریسیور مقرر کیا۔ اس تمام کوشش کے نتیجہ میں کل چھ سو روپیہ فراہم ہو سکے میں نے اُن کی اہلیہ کے پاس بھیجنا چاہا مگر ان کا پتہ نہ چلا۔ بالآخر تین سال کے بعد ہائی کورٹ نے انڈیا گورنمنٹ کے ذریعہ پتہ چلا کر یہ ساری رقم اون کی اہلیہ کے پاس روانہ کر دی۔

میری خطرناک علالت؟ —

رام بھاؤ لوکھنڈے کی موت کا صدمہ ابھی میرے دل سے مٹنے نہیں پایا تھا اور اُن کو دنیا سے سدھارے ہوئے ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ میں بھی اوسی خطرناک مرض بلیک واٹر میں مبتلا ہو گیا۔ جس میں لوکھنڈے کی جان جا چکی تھی۔ اور ان کے علاوہ ہر سال سیکڑوں انسان اسی مہلک بیماری سے روانہ عدم ہوتے رہتے تھے۔ میرے دل پر اپنی زندگی کی جانب سے یاس چھا گئی۔ ڈاکٹر صاحب بھی بستی میں موجود نہ تھے۔ خود پروانشل کمشنر صاحب ازراہ کرم میری قیام گاہ پر تشریف لا کر اس مرض کی مقررہ دوا مجھے پلایا کرتے۔

چونکہ ابھی میری زندگی باقی تھی اس لئے خدا کے فضل سے ایک ہفتہ میں مجھے اس مرض سے نجات مل گئی۔ مگر میری کمزوری میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر نے اس دشمن صحت جگہ سے تبادلہ کی باضابطہ سفارش کی۔ جس نے قبولیت

حاصل کی اور میرا تبادلہ نیمولے سے منڈی کو ہو گیا۔

رشوت ستانی کے مواقع جب تک میں نیمولے میں رہا پراونشل کمشنر کا میر منشی رہا۔ یہ عہدہ اختیارات واثر کا تھا اس لئے اگر میری جگہ پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید مشکل ہی سے وہ اپنے آپ کو رشوت ستانی سے محفوظ رکھ سکتا۔ میرے پاس اہل غرض اور صاحبان معاملہ آتے اور اپنی ضروریات ومشکلات کو رفع کرنے کے لئے بیش قرار رقمیں میرے سامنے پیش کرتے مگر میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا دل کبھی ان ناجائز رقموں کی جانب نہیں جھکا جس کا جو کام جائز حد کے اندر ہوتا اُسے میں خود ہی انجام دیدیتا اور ناجائز کام کی انجام دہی کے لئے میرے پاس انکار کے سوا اور کچھ تھا

ڈاکٹر اسٹونی کے ہاتھی نے ٹکڑے کر دئے نیمولے میں ایک اور نہایت ہی افسوس ناک واقعہ مشاہدہ میں آیا جس کا اثر میرے قلب پر اس وقت تک ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر اسٹونی جو یہاں کے میڈیکل آفیسر تھے اور جن کے زیر علاج ہمارے آنجہانی دوست مسٹر لوکھنڈے بھی رہے تھے۔ ایک روز ہاتھی کے نزدیک آنے کی خبر پاکر اپنے اردلی کے ساتھ اُسے شکار کرنے کی غرض سے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک بڑی بندوق تھی اور اُن کے اردلی کے پاس بھی ۳۰۲ بور کی ریگولیشن رائفل تھی۔ یہ جب اُس مقام پر پہونچے جہاں ہاتھی سامنے ہی تھا تو انہوں نے اُس پر

بندوق چلائی غالباً نشانہ خطا ہوگیا اور ہاتھی مشتعل ہوکر اس پر حملہ آور ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے متواتر فیر کئے تقریباً دو درجن کارتوس جو اُن کے پاس تھے سب ہی صرف ہوگئے اور ان کا اردلی بھی برابر فیر کرتا رہا۔ مگر سب بے اثر ہوا۔ ہاتھی نے جھپٹ کر ڈاکٹر صاحب کے پاؤں کو سونڈ کی گرفت میں لیا اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں نہایت بیدردی سے پٹخ دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک پاؤں سونڈ میں اور دوسرا کمر سے الگ ہو کر دور فاصلہ پر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس واقعہ کی اطلاع نیمولے پہونچی لوگ دوڑ کر آئے مگر ڈاکٹر صاحب کی روح پرواز کر چکی تھی اور ہاتھی بھی (جو بندوق کی گولیوں سے کافی زخمی ہو چکا تھا) تڑپ تڑپ کر مر چکا تھا۔

مسنڈی میں

جیسا ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میرا تبادلہ نیمولے سے مسنڈی کو ہوگیا۔ چنانچہ میں آہنی کشتی کے ذریعے دریائے نیل کو عبور کرتے ہوئے بوٹیابا آیا۔ اور وہاں سے خشکی کی راہ لی تین چار یوم کے بعد مسنڈی پہونچا۔

یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ یہ تمام علاقہ ایک اسسٹنٹ کلکٹر کے تحت انتظام تھا۔ کلکٹری کا پورا عملہ دو شخصوں پر مشتمل تھا ایک کلکٹر اور دوسرا میں جو اون کی نیابت و ہلکاری کے فرائض انجام دیا کرتا تھا یہ بھی عجیب ویران مقام تھا۔ اشیاء ضروری تک دستیاب نہیں ہوتی تھی تمام بستی میں صرف تین چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں، ان میں دو ہندوستانیوں اور ایک عرب کی دکان تھی۔ یہاں نہ کوئی دواخانہ تھا اور نہ ڈاکٹر

جب کوئی بیمار ہو جاتا تو اُس کے لئے ۲۵ میل کی مسافت سے ڈاکٹر بلایا جاتا جو مقام Hoima ہائیما میں رہتا تھا۔

اسسٹنٹ کلکٹر ہاتھی کے شکار ہو گئے۔ میں نے یہاں آکر یہ واقعہ سنا کہ اب سے تقریباً ایک سال قبل یہاں کے مختار مطلق یعنی اسسٹنٹ کلکٹر بھی ہاتھی کے شکار کرنے میں خود شکار ہو گئے۔ اور موذی ہاتھی نے صاحب بہادر کو بیسکر سر بنا دیا اور کسی قسم کی طبی امداد اُن کی جان رفتہ کو واپس نہ لا سکی۔ یہاں اس قسم کے دردناک حادثے اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں ہاتھی کے مارے ہوئے اسسٹنٹ کلکٹر کی موت کے بعد یہاں کا انتظام عارضی طور پر مولوی عبدالکریم صاحب نامی ایک نیک مسلمان کے سپرد ہوا۔ یہ مدراس کے رہنے والے تھے اور ان میں انتظام کی خاص قابلیت تھی اور ہر طرح اس کے مستحق تھے۔ کہ ان کو ٹراسے ٹرا مستقل عہدہ دیا جائے۔ چنانچہ ان کے والد نے جو ایک وظیفہ یاب صوبہ دار تھے، اور جن کے وفادارانہ احسانات برطانوی حکومت پر تھے) انڈیا آفس کے ذریعہ کلونیل آفس (Colonial Office) میں بہت کوشش کی کہ لائق و فائق بیٹے کا اسسٹنٹ کلکٹری پر مستقل تقرر ہو جائے۔ یوگانڈا کی مقامی حکومت نے بھی پرزور تصدیق کی تھی کہ عبدالکریم ہر طرح اسسٹنٹ کلکٹری کے لئے نہ صرف موزوں بلکہ ہر عنوان سے بہترین شخص ہیں لیکن اقتدار اعلےٰ نے صاف انکار کر دیا کہ فی الحال کسی ہندوستانی کو ایسی ذمہ دارانہ مستقل ملازمت نہیں دیجا سکتی۔

میر القرر۔ مولوی عبدالکریم صاحب افتدار اعلا کے اس جواب سے بہت بد دل ہو گئے۔ اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس طوق ملازمت کو گلے سے نکال دیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلے انہوں نے ایک طویل رخصت حاصل کی۔ اور ہندوستان چلے گئے اور پھر دوبارہ اپنی ملازمت پر واپس نہیں آ رہے۔ اون کے جانے کے بعد میر القرر اون کی جگہ پر ہوا۔

اہلکاری کے پردے میں اسٹینٹ کلکٹری ہمارے دفتر کو دیوانی اور فوجداری دونوں کے کامل اختیارات حاصل تھے۔ کلکٹر صاحب سال میں چھ ماہ دورے پر رہتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں باوجود ایک اہلکار ہونے کا تقریباً سارے اختیارات مجھے حاصل ہو جاتے تھے۔ یہاں یہ دستور تھا کہ مستغیث کے جملہ عذرات اور فریقین کے تصفیے زبانی ہوا کرتے تھے۔ خواہ دیوانی کے ہوں یا فوجداری کے چونکہ مجھے وارنٹ پر دستخط کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس لئے مجرموں کو بغیر وارنٹ ہی کے گرفتار کر کے قید میں رکھنا پڑتا تھا۔ ملکی لوگوں کے مقابلہ میں جب کوئی استغاثہ ہوتا تھا تو اس کی سزا تازیانہ زنی کی صورت میں زبانی سنا دی جاتی تھی اور اس کی اسی وقت تعمیل بھی ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی سزا عام طور پر اسے ۲۴ تازیانوں تک ہوا کرتی تھی۔

حکام کا رویہ ماتحتوں کے ساتھ (جب میں منڈی MASINDI)

آیا تو اُس زمانہ میں ایک نئے اسسٹنٹ کلکٹر صاحب کا بھی تقرر عمل میں آیا تھا یہ اپنے ماتحت ہندوستانیوں اور گوانیز کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے انگریز حکام بھی عام طور پر خوش رو یہ ہوتے تھے لیکن کچھ ایسے افسر بھی گاہے گاہے آجاتے تھے۔ جن کا سلوک اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا نہ ہوتا تھا۔ اور عملے کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ اور اکثر مارنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔

میرے قیام منڈی کے زمانے میں یکے بعد دیگرے تین اعلےٰ عہدہ دار آئے مگر تینوں کا اخلاق میرے ساتھ نہایت ہی اچھا رہا اور میری انسانیت کو اُن کے عادات و اطوار سے کبھی کوئی گلہ نہیں کرنا پڑا۔

مسٹر انڈرسن کی تشریف آوری

کافی عرصہ کے بعد یہ خبر ملی کہ ایک نہایت ہی سخت انڈرسن نامی انگریز کلکٹر ہوکر منڈی آنے والا ہے۔ یہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے اس علاقے میں بہت بدنام تھا اور لوگ اس کا نام سنتے ہی گھبرا اٹھتے تھے۔ ان کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے ایک ہندوستانی عیسائی اہلکار جوزف (JOSEPH) نامی کو مارا تھا

جو حیدر آباد دکن کا رہنے والا تھا۔ مگر جوزف صاحب بھی تسلیم ورضا کے خوگر تھے وہ مار کھا کر خوش رہے اور انہوں نے اپنی ذلت کا ذرا بھی احساس نہ فرمایا اور بدستور اس ملازمت کو اختیار کئے رہے۔ میں کہتا ہوں کا کہ خودداری کا خون کرکے رزق حاصل کرنا، انتہائی بے غیرتی ہے۔ ایسی شکم پری جس میں انسانی روح اور بشری اسپرٹ کی تذلیل ہو، مستقل ملامت ہے۔

تقسیم فرائض نے عہدہ داری کے مدارج قائم کئے ہیں۔ ہر ملازم کو اس کا پورا احساس ہونا چاہئیے۔ مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ انسان صیغہ، نوکری میں داخل ہونے کے بعد تمام ایسے صفات سے مستثنیٰ ہوگیا ہے جو عزت نفس کے لئے لازم ہیں۔ جوزف صاحب کا مار کھا کر بھی راضی برضا رہنا، اور ملازمت کو ضمیر وانسانیت کے احترام پر ترجیح دینا حد درجہ افسوسناک واقعہ ہے

مسٹر انڈرسن کی سختی: مسٹر انڈرسن نے منڈی آنے سے قبل جنجا سے ایک تار میرے نام اس مضمون کا بھیجا کہ:۔

"میں آرہا ہوں بنگلہ صاف کرایا جائے"

حسب الحکم بنگلہ صاف کرایا گیا۔ صاحب بہادر تشریف لائے۔ یہاں کے پہلے کے کلکٹر بسلسلۂ علالت رخصت لے کر کہیں باہر تشریف لے گئے تھے وہ بھی جائزہ دینے کے لئے آئے۔ مسٹر انڈرسن نے جائزہ لے لیا،

اور دفتری کام حسب معمول و دستور جاری ہوگیا۔

جیسے کوتسیا مسٹر انڈرسن کو زیادہ تر افریقہ اور گوا کے رہنے والے کمزور، اور ضعیف القلب اہلکاروں سے سابقہ پڑا تھا۔ اور وہ اُن پر بے جا ظلم و تعدی اور ناجائز طرز حکمرانی کرتے کرتے اس امر کے عادی ہو گئے تھے کہ وہ عام طور پر ہر کس و ناکس سے نہایت سختی سے پیش آئیں۔ افریقہ کے اہلکار عموماً نیکدل اور سیدھے سادے ہوا کرتے ہیں اور بہت جلد رعب میں آجاتے ہیں اور گوا کے اہلکار بھی بہت ہی نرم دل اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ گو یہ لوگ شراب نوشی کے بہت عادی ہوتے ہیں۔ اور نشہ کی حالت میں بیہودہ بکنے لگتے ہیں۔ مگر اس حد تک حدود ہوش سے متجاوز نہیں ہوتے کہ آپس میں زد و کوب پر اُتر آئیں جیسے ہمارے ہندوستان میں اکثر مشاہدے میں آتا رہتا ہے پھر چونکہ یہ لوگ علم سے عموماً کورے ہوتے ہیں اس لئے ان میں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ سخت عہدہ داروں کو جواب دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ حکام مقتدر گوا کے باشندوں کو اپنی ماتحتی کے لئے زیادہ پسند کرتے تھے اور ان کو ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرتے تھے۔

مسٹر انڈرسن جن کی عادت پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ بھی بدمزاجی کے ساتھ پیش آنا چاہتے تھے۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جس طریقہ افریقہ اور گوا کے رہنے والے اہلکاروں کے

ساتھ وہ ناجائز طور سے پیش آتے تھے اور جیسے وہ ہر ایک کو "بلیڈی فول" کہنے کے عادی تھے۔ مجھے بھی کہنا چاہتے تھے مگر میرے پاس ان کے اس نامہذب کلمے کا جواب پہلے ہی سے تیار رکھا وہ یہ کہ "یو بلیڈی فول۔"

مجھے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے تین چار یوم گزر گئے مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی کہ وہ مجھے نامہذب کلمات سے خطاب کرتے اور مجھے بھی ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ کڑوے جواب دینے کی ضرورت پیش آتی۔

"سر" نہ کہنے کا جرم اور اُسکی سزا

چوتھے روز اتفاق پراونشل کمشنر صاحب منڈی تشریف لائے۔ اور انڈرسن صاحب کے بنگلے ہی میں فروکش ہوئے افریقہ اور یوگنڈہ اسٹیٹ کے دفاتر کے اوقات ۸ تا ۱۲ ساعت اور ۲ تا ۴ ساعت تھے۔ مسٹر انڈرسن تقریباً ایک بجے لنچ کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے لنچ کو جانے سے قبل مجھے اپنے آفس میں طلب کیا۔

دلچسپ مکالمہ

میں حسب الحکم حاضر ہوا اور اُن کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ صاحب بہادر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ غیض و غضب کی چنگاریاں اُن کی آنکھوں سے نکل رہی تھیں مجھے نہایت ہی غصے کی ادا سے دیکھا اور اپنے

اردلی کو حکم دیا کہ بید لائے۔ بید لایا گیا صاحب بہادر نے وہ بید ایک خاص ادائے غرور، سے سامنے کی میز پر تیڑھا کر کے رکھا اور نہایت کرخت اور مرعوب کن لہجے میں چیخ کر مجھ سے دریافت کیا۔

"مجھے خطاب کرتے یا میری کسی بات کا جواب دیتے وقت تم "سر" کا لفظ کیوں استعمال نہیں کرتے۔

میں اثنائے گفتگو میں "سر" کا لفظ استعمال کرنا یا نہ کرنا محض میرے اختیار تمیزی پر منحصر ہے۔ میں قانوناً ہرگز اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور نہیں ہوں"

میرا یہ معقول جواب صاحب بہادر کو بہت برا معلوم ہوا۔ وہ اس جواب کو کسی ماتحت سے کبھی امید نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ انتہائی غصے کی حالت میں چلا کر اور میز پر زور زور سے بید ٹیک ٹیک کر کہنے لگے۔

"تم کو مجھ سے گفتگو کرتے وقت "سر" کا لفظ استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ یہ میرا آرڈر ہے۔ میں نے دیکھا کہ صاحب بہادر، ایک ماتحت ہندوستانی سے خطاب کرتے وقت اپنے کو انسانیت کی سطح سے بہت اونچا، اور اس کو بہت ہی پست محسوس فرما رہے ہیں۔ اُن کی اس بد دماغی نے میرے رگ خود داری پر نشتر کا کام کیا، میں نے یہ دیکھکر کہ وہ بار بار بید کو تول رہے ہیں اور اس کا انداز ہے

کہ کہیں وہ غیض کی حالت میں مجھ پر حملہ نہ کر بیٹھیں تو میں نے بھی سامنے کی میز پر رکھے ہوئے رُول کو اٹھالیا۔ اور رول کو اپنے ہاتھ میں لیکر تولنا شروع کیا۔ صاحب بہادر کی اس گفتگو سے مجھے بھی آپے سے باہر کر دیا تھا۔ میں اس کا تہیہ کر چکا تھا کہ اگر صاحب بہادر نے مجھ پر بید چلانے کی کوشش کی تو میرے لئے ضروری ہو جائے گا کہ میں اُن کی اس کوشش کا کامیاب ہونے سے پہلے اُن کی رُول، سے خاطر خواہ تواضع کر دوں۔ افسری اور ماتحتی کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ افسر حدود انسانیت و تہذیب سے باہر ہو جائے اور وہ اپنے ماتحت کو جانور سے بھی بدتر سمجھے۔

جب صاحب بہادر نے میرے یہ تیور دیکھے تو انہوں نے اس میں مصلحت دیکھی کہ وہ اپنے اس انسانیت سوز سلوک میں فوراً تغیر پیدا کریں۔

الغرض میرے ہاتھ میں رول کو دیکھ کر صاحب بہادر فوراً ٹھنڈے پڑ گئے، اُن کی آواز بھی مدھم ہو گئی اور چہرے کی سرخی" زردی میں بدل گئی اور فرمانے لگے:۔

تم میرے لئے "سر" (sir) کا لفظ استعمال کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اس لئے میرے بنگلہ پر آؤ۔ میں تمہاری شکایت پر وانشل کمشنر صاحب سے کروں گا۔

میں آپ کے بنگلہ پر آنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ یہ کام دفتر یا

میرے فرائض سے مطلق متعلق نہیں ہے۔

صاحب بہادر اگر تم نہیں آئے تو پروانشل کمشنر صاحب تم کو خود طلب کرلیں گے۔

میں اس کی فکر آپ کو کیوں ہے۔؟ جب پروانشل کمشنر صاحب مجھے طلب کریں گے تو میں خود غور کرلوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

صاحب بہادر یہ جواب سن کر بالکل خاموش ہوگئے۔ اور لنچ کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد دوسرے وقت، دفتر میں خود صاحب بہادر ہی نہیں تشریف لائے۔ اور نہ پروانشل کمشنر صاحب ہی نے مجھے بلایا۔

صاحب بہادر بدل گئے دوسرے روز جب میں دفتر گیا، تو صاحب بہادر" بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اور میری کل کی گفتگو کے جو نتائج نکلنا چاہیئے تھا گویا وہ سب نکلے ہوئے تھے۔ آج صاحب بہادر بالکل ٹھیک، اور آن کے طرز عمل میں انسانیت و شرافت کی جھلک نمایاں تھی انہوں نے اب جب کسی ضرورت سے مجھے یاد فرمایا "مسٹر ساولے" کہہ کر مخاطب کیا۔ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو میں نے بھی اپنے طرز عمل میں مناسب تبدیلی کردی۔ کیونکہ میرا مقصد نہ تو شرارت تھا اور نہ گستاخی بلکہ صاحب بہادر کو صرف اسقدر جتانا مقصود تھا کہ

کہ ماتحت اہلکار بھی خودداری کے جذبات سے محروم نہیں ہوتا۔ اُس کی رگوں میں دوڑنے والا شریف خون، ملازم ہوتے ہی خشک نہیں ہو جاتا۔ وہ بھی عزت رکھتا ہے۔ اگر اُس کی عزت کی گئی تو وہ بہترین عزت کرنے والا ہوتا ہے اور اگر اُسے ذلیل کیا گیا تو وہ مجبور ہے کہ اپنی عزت بچانے کے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کر گزرے۔ اپنے کو ذلیل کر کے شکم پُری کرنا بشری شرافت کے قطعی منافی ہے۔ ہمارے پیارے ہندوستان کے محب وطن و محبوب قوم شاعر علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اے طائر لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اب جب وہ مجھے مسٹر ساولے کہکر نہایت ہی نرم و شیریں لہجے میں مخاطب کرتے تو میں بھی (Yessir) "یس سر" کے الفاظ میں اُنکو جواب دینے میں خوشی محسوس کرتا

اس واقعہ کے بعد تدریجاً "مسٹر انڈرسن" میں غیر معمولی انسانیت نرم دلی اور شفقت کے خصائص پیدا ہونے لگے یہاں تک تھوڑے ہی زمانے میں وہ میرے بڑے دوست ہو گئے اور میرے دل میں بھی اُن کی عزت و احترام کے چراغ روشن ہونے لگے۔ اب تو یہ ہو گیا کہ وہ میرے بڑے ہمدرد اور مخلص بن گئے اور میں بھی ان کا ایک اطاعت گزار، ماتحت بن گیا۔ اونہوں نے باصرار مجھے

مجبور کیا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقے میں ہزار پانچ سو ایکڑ زمین مفت پٹہ پر لے لوں جو میرے لئے بیحد نفع بخش ثابت ہوگی۔ مگر میں نے انکار ہی کیا۔ کیونکہ وہاں زمین لینے کے معنی یہ تھے کہ میں پھر ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو جاتا اگر میں وہیں بود و باش اختیار کرنے کا عزم رکھتا تو اتنی زمین پٹہ پر لینے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ وہ مجھے مفت دے رہے تھے مگر میں نے اپنے کو اُس سرزمین کا پابند کرنا نہیں چاہا۔ بس میں میرے ہی روح کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔

ہاتھی کا شکار

ضلع منڈی ہاتھی کے شکار کے لئے ایک اہم اور معروف مقام تھا۔ بڑے بڑے شکاری مختلف اطراف سے یہاں آتے اور شکار کرتے۔ یہاں جو کلکٹر آتا وہ علاوہ سرکاری پیش قرار مشاہرے کے اس طرح بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کرتا کہ ہاتھی کے شکار کرتا اور اُن کے دانتوں کو فروخت کراتا مگر یہ سہولت صرف انگریز آفیسروں کو حاصل تھی۔ کیونکہ انھیں پندرہ روزہ اجازت نامہ تیس روپیہ فیس ادا کرنے کے بعد مل جاتا تھا۔ جو

دو ہاتھیوں کا شکار کرسکتا تھا۔ لیکن ہندوستانیوں کو یہ سہولت اور مراعات حاصل نہ تھیں۔ میں کسی زمانے میں جب ایک ہندی ریاست میں تھا تو دیوالی کے موقع پر لوہے کی نلیوں میں بارود بھر کر اُن کو توپ کی طرح چھوڑتا تھا۔ چونکہ یہ ایک ریاست تھی اس لئے اتنا بھی کر لیتے تھے ورنہ انگریزی علاقے میں شاید ایسا نہ کرسکتے۔

چونکہ میں بچپن میں ایسے کھیل کھیلنے کا عادی تھا اس لئے اور لوگوں کی طرح بندوق میرے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی۔

جب میں یوگانڈا آیا تھا تو میں نے پرندوں کے شکار کے لئے بارہ بور کی ایک بندوق خریدی تھی۔ جو بڑے جانوروں کے شکار میں کام نہیں دیتی تھی۔ بڑے جانوروں کے شکار کے لئے دوسری قسم کی بندوقیں کارآمد ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل عرض کی جائے گی۔

کالی بارود

سیموئیل بیکر۔ سپیک اور اسٹانلی جیسے ممتاز و مشہور سیاح اور محقق لوگوں کی تصنیفات کے مطالعہ کرنے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان غیر معمولی ماہر شکاریوں کو بھی ہاتھی کے شکار میں بیحد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں بندوق کے کارتوسوں میں کالی بارود استعمال کی جاتی تھی۔ اس بارود کا عمل یہ تھا کہ وہ گولی میں قوت، شدت۔ اور سرعت پیدا کرے مگر جو مقدار بندوق کے

اندر کھپ لی جا سکتی تھی وہ ایک ہاتھی کو مارنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اور اگر زیادہ بارود بھر دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بندوق کی نالی پھٹ کر خود شکاری کو شکار کر لیتی تھی۔ ان پیچیدگیوں کی وجہ سے ہاتھی کا شکار بیحد مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قسم کے بندوقوں اور کالی بارود سے شکار کے کامیابی حاصل کرنے والے کسی طرح اُس باہمت شکاری سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے جو تلوار سے روبرو شیر کا مقابلہ کر کے شیر کو مار گراتے ہیں۔ پھر بعد کو ایسا ہونے لگا کہ لوگ ہاتھی کے شکار کے لئے بڑی بندوقیں بنوا کر شکار کرنے لگے مگر کالی بارود کے استعمال سے شکار ہمیشہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ کیونکہ خونخوار بڑے جانوروں کے شکار میں ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ کہ پہلی گولی ہی ایسی کارگر ہو کہ اوسی میں شکار ختم ہو جائے یا کم از کم اس بری طرح زخمی ہو جائے کہ وہ شکار کرنے والے پر حملہ کی جراءت نہ کر سکے۔ کالی بارود سے یہ دونوں باتیں کما حقہٗ نہیں پوری ہو سکتی تھیں۔ بلکہ اس میں اس ناقابل تلافی خرابی اور تھی وہ یہ کہ اس سے اسقدر زیادہ اور سیاہ دہواں پھیل جاتا تھا کہ شکار کرنے والا یہ اندازہ لگانے میں بیحد دشواری محسوس کرتا تھا کہ آیا اُس کی گولی جانور کو لگی ہے یا نہیں؟

گزشتہ صدی کے آخر میں کارڈائٹ بارود

کارڈائٹ بارود

کی ایجاد ہوی۔ یہ تھا اُن خرابیوں سے مبترا

تھی جو کالی بارود میں پائی جاتی تھیں۔ خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں دھواں نہیں ہوتا اور کالی بارود سے کہیں زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ جب سے اس بارود کے رائفل شکاریوں کے ہاتھ آئے۔ ہاتھی گینڈا، شیر، جنگلی بھینسا اور دیگر جسیم اور خونخوار جانوروں کے شکار کی مشکلات بہت کم ہوگئیں۔

تیس گرین کارڈائٹ بارود کے وہ کارتوس جو عام طور پر سپاہیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ ۲۰ تا ۲۵ گز کے فاصلے سے ہاتھی کی چھاتی کو اچھی طرح مجروح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

سلیقہ شکار مختلف شکاریوں کے شکار کے سلیقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ بعض شکاری ۳۰ تا ۴۰ گرین کارڈائٹ کی چھوٹے منہ والی ہلکی بندوق شکار کے لئے پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اس سے کامیابی کے ساتھ شکار کرتے ہیں۔ لیکن محتاط قسم کے شکاری ۴۵۰ - ۵۰۰ - ۵۷۷ - بلکہ بعض اوقات ۶۰۰ بور کے یعنی ۷۰ تا ۱۲۰۰ گرین کارڈائٹ کے کارتوس چھوڑنے والی بندوق کا استعمال زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی بندوقوں کے نشانے ناکام یا کم اثر ثابت ہوتے ہیں۔

چھوٹے رائفل میں بیک وقت ۵ سے ۱۰ تک کارتوس بھرنے کے لئے میگزین ہوا کرتا ہے۔ جس سے شکاری کو ایک گونہ بڑی سہولت رہتی ہے۔ برخلاف اس کے بڑے بور کے رائفلس صرف یک ضربی

ہوا کرتے ہیں۔

بڑی بندوق اگر یک ضربی ہو تو کھڑے ہو کر بآسانی نشانہ لگایا جا سکتا ہے اور اگر دو ضربی ہو تو بیٹھکر نشانہ لگانے میں سہولت ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ شکار کے موقع پر ہمیشہ بیٹھکر نشانہ لگانے کی نوبت آئے۔ کیونکہ اکثر ایسے مواقعہ پیش آتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نشانہ لگانا محل و مقام کے لحاظ سے ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً جب شکار کا تعاقب کیا جا رہا ہو تو اُس موقع پر بیٹھنے اور بیٹھکر نشانہ لگانے کی نوبت کب میسر آسکتی ہے بعض اوقات اسی میں سہولت اور کامیابی ہوا کرتی ہے کہ ساتھی کے کاندھے پر بندوق کی نالی کو رکھ کر نشانہ لگایا جائے۔

شکار کا اجازت نامہ منڈی کے علاقے میں کوئی شخص شکار کرنے کا قانوناً مجاز نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ وہ باقاعدہ سرکاری اجازت نامہ نا حاصل کرلے۔ مجھے شکار کا شوق نہیں بلکہ جنون سا ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے حسب قواعد سات سو پچاس (۷۵۰) روپیہ داخل کر کے ایک سال کے لئے اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ اس اجازت نامہ کی رو سے میں سال بھر اس علاقے میں قانون کے نامزد کردہ اور مشروط جانوروں کا شکار کر سکتا تھا۔

اجازت نامہ میں شکار کئے جانے والے جانوروں کی تعداد

اور اُن کی نوعیت درج ہوتی ہے۔ میرے اجازت نامہ میں دو ہاتھی بھی شامل تھے۔ ہاتھی سے مراد ایسے ہاتھی تھے۔ (۱) جو مادہ نہ ہوں نر ہوں (۲) ایسے ہاتھی جن کے ہر دانت کم از کم تیس۳۰ پونڈ وزنی ہوں یا اس سے بھی زیادہ معمر ہوں تھے نی یا تیس۳۰ پونڈ سے کم وزن دانت کے ہاتھی کا شکار کرنا قانوناً بہت بڑا جرم تھا۔ جس کی پاداش میں ہاتھی دانت کی ضبطی۔ ہزار روپیہ جرمانہ یا چھ ماہ کی قید بامشقت یا دونوں سزائیں ساتھ ساتھ دی جاتی تھیں۔

ہاتھی کے شکار کیلئے حصول اجازت نامہ کچھ روز بعد مجھے یہ خبر ملی کہ گاؤں سے دس پانچ ہی میل کے فاصلے پر ہاتھی آئے ہوئے ہیں پھر اُس کے چند دنوں کے بعد یہ اطلاع ملی کہ آج ہاتھی بالکل ہی قریب صرف تین چار میل کے فاصلے پر آ گئے ہیں۔ اس وقت میرے ذوق وشوق کا عالم نہ پوچھئے۔ دل مارے خوشی کے بلیوں اچھل رہا تھا۔ لیکن ایک اہم مسئلہ سامنے تھا کہ میری ذاتی بندوق پرندوں کے شکار کے قابل تھی۔ اُس سے ہاتھی کا شکار کیونکر ممکن ہے۔ مگر یہ مشکل اس طرح حل ہوگئی۔ کہ میرے قبضہ میں پولیس کی ۲۵ سرکاری بندوقیں تھیں میں نے اپنے دل میں کہا کہ سردست انھیں بندوقوں سے کام چلاؤں گا میں نے دو آدمیوں کو پولس کے بندوقیں دے کر پہلے روانہ

کر دیا۔ اور میں سہ پہر کو تنہا سائیکل پر سوار ہو کر وہاں پہونچا۔ میرا دل اس وقت تک ہاتھی سے مطلق مرعوب نہ تھا کیونکہ میں اپنے بچپن میں بزمانہ قیام بڑودہ کئی بار ہاتھی پر بیٹھ چکا تھا۔ اور یہ سمجھتا کہ ہاتھی بالکل بے ضرر جانور ہے یہ خیال اس وقت تک میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

میں نے گھر سے نکلتے وقت یہ عزم مصمم کر لیا تھا کہ خواہ کیسا ہی ہاتھی کیوں نہ ملے میں ضرور شکار کروں گا۔ میں اُس مقام پر پہونچا جہاں ہاتھی بتائے گئے تھے۔ یہاں مخبر اور دوسرے ساتھی میرے منتظر ہی تھے۔ میں سائیکل سے اُترا اور مخبر کی رہنمائی میں گھنے جنگل میں گھسا۔ جو درختوں اور گھاسوں کی کثرت کے سبب بیحد گنجان تھا، اس جنگل کے درخت تو درخت معمولی گھاس کی بلندی بھی آدمی کے قد سے دوگنی تھی۔ چونکہ ادھر سے ہاتھیوں کا گزر ہو رہا تھا اس لئے اس گنجان قطع میں اُن کے چلنے سے ایک راستہ بن گیا تھا۔ ہاتھیوں کے بنائے راستے سے شکاری بھی گزرا کرتے تھے۔ میں بھی انہی راہوں پر مخبر کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ آج اتفاقاً پہلے ہی سے میرا مزاج ناساز تھا دوسرے علاوہ کچھ ملیریائی بخار بھی تھا جو اُسی علاقے میں وبائے عام کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اشتیاق شکار میں میں نے ناسازی طبع کی مطلق پروا نہ کی۔ میں پیچھے متواتر چلتا رہا۔ چلتا ہی رہا یہاں تک کہ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اکسا گیا اب مجھ پر درہا سر

اور بخار کی تکلیف نے بھی غلبہ پانا شروع کیا۔ اول میں کہتا تھا کہ کاش ہاتھی جلد دکھائی دیں۔ کاش شکار سے جلد فارغ ہوکر مکان واپس چلیں۔ اس دوران میں مخبر جو مجھ سے چند قدم آگے تھا رکا اور اُس نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر ایک جانب اشارہ کیا کہ وہ دیکھئے ہاتھی ہے۔ میں یہ سنتے ہی ٹھہرا اور سردار رفیق شکار کے ہاتھ سے بندوق لے کر اُس کے بتائے ہوئے رُخ پر غور سے دیکھنے لگا مگر جنگل اس قدر گنجان اور گھنا تھا کہ مجھے کچھ نہ دکھائی دیا۔

رہبر پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ ذرا دور چلکر اُس نے اشارہ سے بتایا وہ دیکھئے ایک چھوڑ دو ہاتھی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ کوئی ۵۰ پچاس گز کے فاصلے پر گھاس کے گنجے جنگل میں دیکھا کہ دو ۲ بہت بڑے بڑے ہاتھیوں کے سر نظر آرہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہاتھی نہایت آہستہ آہستہ چل رہے ہیں اور گھاس کی بالائی سطح پر صرف اُن کے سر نظر آرہے ہیں باقی تمام جسم گھاس اور درختوں کے گنجان ہجوم میں چھپا ہوا ہے۔ پھر جب وہ ہاتھی کچھ اور آگے بڑھے تو ایک جگہ جہاں کچھ ذرا سی جگہ کھلی ہوئی تھی اُن کے سر اور نمایاں ہوئے بلکہ ان کے دانت بھی دکھائی دینے لگے۔ اس وقت میرے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ یہ موقعہ اچھا ہے جلد نشانہ جما کر گولی چلائے۔

میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھیوں کے متعلق اب تک جو میرا تصور تھا وہ غلط تھا۔ جونہی میری نظر ہاتھیوں کے بڑے بڑے سروں پر پڑی تو گویا یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں جو ہاتھی میں نے دیکھے تھے۔ اُن سے یہ بالکل مختلف ہیں۔ یہ بہت مہیب انتہائی دہشت آفریں دکھائی دیتے تھے۔ اب مجھ میں بندوق اٹھانے۔ نشانہ جمانے اور گولی چلانے کا وہ حوصلہ باقی نہ تھا جو ان ہاتھیوں کے دیکھنے سے قبل تھا۔ میں بالکل سست اور مدھم پڑ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات تیزی سے دوڑنے لگے۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میری معمولی بندوق کی گولی ان کوہ پیکر ہاتھیوں پر کیا اثر کریگی۔ میرا گولی چلانا ہرگز مصلحت نہیں۔ کیونکہ یہ گولی تو ان کے لئے ایک مکھی کے برابر حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں گولی چلا کر ان کو چوکنا کر دینا ہے۔ اور ان کو اپنا دشمن بنا لینا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری گولی سے مرتے تو نہیں۔ پھر سوا اس کے کچھ حاصل نہیں کہ گولی کی آواز سُنکر یہ اپنے رُخ کو بدل کر مجھے دیکھیں گے اور الٹا حملہ کر کے مجھے ہلاک کر ڈالیں گے۔ غرض یہ اور اسی قسم کے خیالات کی تیز رو لہریں تھیں جو یکے بعد دیگرے میری سطح دماغ پر گزر رہی تھیں۔ اسی حال میں ہاتھیوں کے وہ دونوں سر جو دکھائی دے رہے تھے۔ میری نگاہ سے اوجھل

ہو گئے اور اُس گنجان جنگل میں پوشیدہ ہو گئے اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں ان کا تعاقب کرتا۔ آخر کار میں نے بندوق ملازم کو دی اور خود سائیکل پر بیٹھکر جس طرح خالی ہاتھ گھر سے گیا تھا ویسے ہی خالی ہاتھ واپس آگیا۔ یہ میری زندگی کے پہلے شکار کی مضحکہ خیز سرگذشت ہے۔

ایک ہفتہ کے بعد دوسرا شکار تقریباً ایک ہفتہ کے بعد پھر مجھے اطلاع ملی کہ بہت سے ہاتھی آئے ہوئے ہیں چنانچہ میں نشاندادہ مقام پر پہونچا۔ یہ کھلا ہوا نہایت وسیع میدان تھا واقعی یہاں بہت سے ہاتھی تھے جو صاف نظر آرہے تھے۔ ہاتھی کے شکار میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ ہاتھی یہ محسوس نہ کر سکے کہ کوئی شکاری اُس کی تلاش میں آیا ہوا ہے۔ اُس کی تدبیر یہ ہے کہ شکاری ایسے رُخ سے کھڑا ہو کہ ہوا کی موجیں اُس کی بو ہاتھی تک نہ پہونچا سکیں۔ کیونکہ ہاتھی کی قوت شامّہ بہت تیز ہوتی ہے اور وہ آدمی کی بو بہت جلد پا لیا کرتا ہے۔ ہاتھی شکاری کی بو پاتے ہی یا تو فرار ہو جاتا ہے یا اگر وہ پہلے سے کبھی کا چوٹ کھایا ہوا ہے تو الٹا شکاری کی گھات میں ہو جاتا ہے اور موقعہ پا کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔

ہاتھیوں کا تماشا

اس وقت حسن اتفاق سے ہوا کا رخ ہماری مخالف جانب تھا۔ اس لئے ہماری آمد کی خبر ہاتھیوں کو نہ ہو سکی۔ میں درختوں کی گنجان قطاروں میں چھپ گیا اور نہایت اطمینان سے ہاتھیوں کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس وقت بڑے مزے کا تماشا تھا۔ کچھ ہاتھی ایک خاص انداز سے بڑے بڑے گرانڈیل درختوں کی مضبوط شاخوں کو سونڈ سے توڑ کر اُن کی نرم کونپلیں کھا رہے تھے۔ ان درختوں میں ببول کے درخت بھی تھے جن کی خاردار شاخوں کو نہایت رغبت سے تناول کر رہے تھے۔ کچھ ہاتھی قد آدم سے دو چند بلند درختوں کو اُن کی جڑوں سے اکھاڑ کر سونڈ میں لئے ہوئے ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ اگر کوئی بہت ہی بڑا اور مضبوط درخت ہوتا تو دو یا دو سے زیادہ ہاتھی متفق ہو کر اُسے دانتوں سے پکڑتے اور سر کی ٹکر دے کر جڑ سے اکھاڑ کر دور پھینک دیتے اور پھر اُن کی نرم و نازک کونپلوں کو جھوم جھوم کر کھاتے۔ جنگل میں جا بجا بڑے بڑے تناور درخت گرے ہوئے نظر آتے جن کو ہاتھیوں نے کونپلیں کھانے کے لئے گرایا تھا۔

یہ جھنڈ ۳۵ - ۴۰ ہاتھیوں کا تھا مگر اتفاق سے ان میں کوئی بڑے دانتوں کا ہاتھی نظر نہ آیا۔

اس لئے میں حسب قواعد شکار، بندوق چلانے کا مجاز نہ تھا۔

مجبوراً شکار سے باز رہا۔

آج گو متعدد ہاتھی بالکل نگاہ کے سامنے تھے اور میں اپنی آنکھوں سے اُن کے دلیرانہ اور بے جگرانہ کرتب دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی میرے دل پر اُن کا رُعب اُس شدت سے طاری نہیں ہوا جیسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

بھالے سے ہاتھی کا شکار اور اُس کی دردناک سزا

منڈی میں ایک نہایت ہی غریب اور پریشان شخص تھا جس کے خاندان کے تمام افراد چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو کر کچھ تو فرشی تھے اور کچھ مر چکے تھے یہ بیچارہ اپنی تنہائی و مفلسی کے باوجود ان صدمات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اُس کے اور کنبے کے لوگوں کے گزارے کا انحصار صرف ایک چھوٹے سے کھیت پر تھا اسی عالم پریشانی میں ایک شریر اور موذی ہاتھی روزانہ رات کو اُس کے محنت سے تیار کئے ہوئے کھیت میں گھس آیا کرتا اور اُسے اجاڑ کرتا۔ یہ بیچارہ سخت تنگ آگیا تھا ایک دن اُس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ مرنا یوں بھی ہے، اور یوں بھی۔ اس سنگ دل ہاتھی کو کسی طرح ختم کرنا چاہئے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہاتھی کو مار کر اُس کی آئے دن کی شرارتوں سے نجات حاصل کر لیں گے اور یا خود میں ہی مارا جاؤں گا۔ غرض دونوں صورتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں غم و فکر سے نجات پا جاؤں گا۔

جب آدمی حد سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے تو آخرکار اپنی جان پر کھیل جانا تک آسان سمجھ لیتا ہے۔ اس شخص کا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ وہ ایک رات اپنے گھر سے ایک بھالا لیکر چلا۔ اور موز کے درختوں کے اندر اُسی چور ہاتھی کی گھات میں بیٹھا حسب معمول ہاتھی آیا۔ اُس کے کھیت میں گھسا۔ یہ شخص بھی پوری ہمت سے پیچھے گیا۔ اور بلا کی تیزی سے اُس نے وہ بھالا اُس ہاتھی کی پسلی میں یکایک بھونک دیا۔ بھالا بھی بہت ہی تیز تھا۔ پسلیوں سے گزرتا ہوا اُس کے کلیجے تک پہونچ گیا۔ ہاتھی اس ناگہانی ضرب کی تاب نہ لاسکا تیورا کر اٹھا اور چنگھاڑتا ہوا بھاگا کہ دو سو گز کے فاصلے پر پہونچکر بیدم ہو کر گرا۔ اور وہیں فوراً مر گیا۔

عدالت کی بوالعجبی اس پریشان حال زندگی سے بیزار، غریب مفلس کو حکومت کے کارندوں نے اس جرم میں کہ ہاتھی کو کیوں مارا گرفتار کر لیا۔ اور مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اس کو ایک ماہ قید کی سزا دی گئی۔

اگر اس قسم کی بہادری، اور دلیری کا کام کسی متمول شخص سے ہوا ہوتا تو اُسے بیش قرار انعام دیا جاتا۔ اخبارات و رسائل میں اُس کے فوٹو شائع کئے جاتے اور اُس کے اعزاز و اکرام میں عصرانے اور عشائیے ترتیب دیئے جاتے۔ مگر چونکہ یہ غریب ایک سیاہ فام محکوم تھا

لہٰذا اُسے سزا دی گئی۔ سچ ہے زبردست مارے اور رونے نہ دے اور غلامی کی پاداش کتنی المناک ہوتی ہے!

غلامی کا مقام

کالے محکوموں اور غلاموں کا گورے رنگ کے حاکموں کی نگاہ میں کیا مرتبہ و مقام، اور وہ ان کو کس دائرے میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا مزید اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

یوگانڈہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ ہر کلکٹر ضلع اپنے علاقے کے نظم و نسق کی ماہانہ رپورٹ کمشنر کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ جس میں پورے ماہ کے اُس علاقے سے متعلق حالات و رجحانات اور واقعات تفصیلاً درج ہوا کرتے تھے۔

اسی طرح ایک ضلع کے کلکٹر نے ایک ماہ کی رپورٹ کمشنر کو روانہ کی جس میں درج تھا کہ بادشاہ سلامت کی سالگرہ کے روز یہاں ایک عظیم الشان جلسۂ مسرت و دعاگوئی منایا گیا جس میں مقامی لوگوں نے بھالے مارنے تیر چلانے وغیرہ کے کرتب اور بہادری کے لائق تماشے دکھائے اس وقت مسٹر ہسکٹ بل (Mr. Hasket Bil) یوگانڈا کے کمشنر (اب کمشنری گورنری سے بدل گئی ہے۔ انھوں نے رپورٹ پر تحریر فرمایا کہ اس قسم کی کوئی ترغیب (جس سے رعایا میں بہادری اور بے خوفی کے جوہر پیدا ہوں) ہرگز نہ دینی چاہئے۔ اور اس تجویز کی اطلاع جملہ کلکٹروں کو بذریعہ گشتی کر دی گئی۔

مسٹر میکیٹ بل کا یہ فرمان اور پھر اس کی تمام اضلاع میں باضابطہ اُس نیک نیتی اور رفاہ خواہی کا بھانڈا پھوڑتی ہے جو اپنی رعایا کے باب میں سفید فام آقاؤں کے دلوں میں متصور ہے اس طرح ہندوستان میں قانون اسلحہ کا نفاذ اور اُس پر سختی سے پابندی کی یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ حکومت اپنی رعایا کو کیا بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اور ان میں بزدلی اور نامردی اور بزدلی کے جرائم کی پیدائش اور اُن کی پرورش کے لئے کیا کچھ انتظام ملحوظ رکھتی ہے۔ آج انگریزوں کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ حکومت کرتے ہوئے گزر گیا۔ مگر اس اتنی طویل مدت میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ فرماں روائی یہ ہے کہ ہندوستانی باشندے اپنے ملک اپنے وطن، اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے — حکومت کی جادوگری نے اہل ہند کے دماغ سے احساس غیرت و خودداری کو اس حد تک فنا کر دیا ہے۔ کہ آج انھیں دنیا کی زندہ اقوام کی صف میں کہیں جگہ نہیں مل سکتی۔ ایک فرض شناس حکومت اپنی رعایا میں اچھے اوصاف پیدا کر کے انہیں بشریت کا اعلیٰ درجہ دینا چاہتی ہے مگر جس حکومت کا مقصد یہ ہو کہ صرف اپنی قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔ وہ حکومت کبھی یہ گوارا نہ کرے گی کہ اس کی رعیت میں بھی انسانیت کے اعلیٰ جوہر اور غیرت و جرأت کے پاکیزہ احساسات پیدا ہوں۔ ہندوستان میں تا وقتیکہ قانون اسلحہ،

کو منسوخ کر کے اسلحہ کے جائز استعمال کی اصولی اجازت نہ دی جائے ہندوستانیوں میں منحصر بے خوفی ضروری بہادری، اور شجاعت کے اوصاف نہیں پیدا ہو سکتے۔

میرا پہلا کامیاب شکار میں ہاتھیوں کے شکار کے لئے اکثر جاتا رہا مگر ناکام ہی لوٹتا رہا۔ میرے پہلے کامیاب شکار کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ میں کچھ دنوں کے لئے منڈی کی آبادی چھوڑ کر جنگل میں رہنے لگا تھا۔ فرصت کے اوقات میں میرا یہ معمول تھا کہ ادھر ادھر ہاتھیوں کی تلاش میں نکل جاتا۔ اور ان کا تماشہ دیکھا کرتا۔ اس طرح روز دوپہر کے وقت میں ایک گھنے جنگل میں گشت لگا رہا تھا۔ کہ نہایت ہیبتناک آواز سنائی دی۔ اس آواز نے میرے قدم روک دئے۔ مگر میں ہمت کر کے ایک درخت پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہاتھی ایک درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ جس کے سر کا ایک حصہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ باقی حصہ درختوں کے ہجوم میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے دانت بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے یہ خیال کیا اس وقت اگر ہاتھی پر گولی چلاؤں تو بہت ہی مناسب ہے اول تو یہ حسن اتفاق ہے کہ درخت پر بیٹھنے کے باوجود نشانہ لگانے میں سہولت ہے، دوسرے خدا نہ کردہ اگر میرا نشانہ خطا بھی ہو جائے تو ہاتھی پلٹ کر مجھ پہ حملہ نہیں کر سکتا۔ اس خیال نے فوراً قوت پکڑی اور میں نے وہیں

بیٹھے بیٹھے اوس کے سر کو تاک کر ایک گولی چلائی نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا اور وہ گولی ایسی لگی کے ہاتھی وہیں تلملا کر گر پڑا اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہاتھی میں اتنی سکت ہی نہیں رہی کہ وہ مجھ پر حملہ کر سکے تو میں درخت سے اتر کر نیچے آیا۔ اُس کے سر کے ایک حصہ سے خون جاری تھا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ گولی اس مقام پر لگی ہے۔ اور زیادہ غور کرنے پر معلوم ہوا داہنی آنکھ کے اوپر لگی ہوی دماغ کے سید ھے رخ میں گھس گئی۔ یہ مقام بہت نازک تھا جس نے گولی کے اثر کو بیش از بیش قبول کیا ورنہ اگر یہی گولی ذرا بچکر سر کی ہڈی کو لگتی تو تقریباً بالکل بے اثر ہوتی اور اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہ نکلتا کہ ہاتھی کو چھیڑ کر اُسے اپنا دشمن بنالیا جاتا۔

ہاتھی کے حصے بخرے

زندگی میں یہ پہلا ہاتھی تھا جسے میں نے شکار کیا۔ اس کامیابی پر میرا دل انتہائی مسرور ہوا۔ میں اپنے کیمپ کو واپس لوٹ آیا اور اس کی اطلاع لوگوں کو دی۔ یہ خبر آناً فاناً بجلی کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ پھر کیا تھا تمام گاؤں دوڑ پڑا۔ کسی کے ہاتھ میں بھالا ہے تو کسی کے پاس خنجر کسی کے پاس تبر ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مرے ہوے ہاتھی کے چاروں طرف اچھا خاصہ ہجوم ہوگیا۔ گاؤں والوں کے لئے ایسے موقع خاص ہوا کرتے ہیں۔ وہ اس جانور کا گوشت نہایت خوشی سے لوٹتے ہیں۔ ہاتھی کے

مختلف اعضا گاؤں کے ممتاز عہدہ دار چودہری پٹیل یا قانون دان دیہاتی کارندوں کا حق سمجھا جاتا ہے اور باقی گوشت عام باشندے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور کبھی لوٹ شروع ہوتی ہے اور جس کے ہاتھ جو آجاتا ہے لیکر چلتا بنتا ہے۔

اس تماشے میں مجھے ایسے لوگ بھی نظر آئے جو نہایت بے صبری کے ساتھ ایک ہاتھ سے خنجر سے گوشت کاٹ رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ویسا ہی کچا گوشت نہایت ذوق و شوق سے کھا رہے تھے۔ سامنے ایک اونچا ڈھیر لگا ہوا تھا یہ ہاتھی کی انتڑیاں تھیں اس طرح ایک مرے ہوئے جانور کے گردا نسانوں کا ہجوم اور پھر اس طرح ان کا ہاتھی کے حصے بخرے کرنا اور بعض کا یونہی کچا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانا۔ نباتاتی برہمنوں کے لئے جسقدر بھی ناگوار اور مکروہ منظر ہو کم ہے۔ خود میں ایسا پکا نباتاتی (ویجیٹیرین) نہ تھا بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اہمسا کے ماحول میں تربیت پائے ہوئے برہمن اس منظر کو دیکھ کر بیحد تکلیف محسوس کریں گے۔ مگر میں ان مناظر کو دیکھ کر کچھ دنوں میں ایسا خوگر ہو گیا تھا کہ مجھے اس میں نہ تو کچھ بیگانگی محسوس ہوتی تھی اور نہ کراہیت میرے نزدیک یہ خون میں ڈوبا ہوا منظر اتنا ہی دلچسپ تھا جیسے بمبئی میں ساحل چوپاٹی پر کھڑے ہو کر سمندر کی سیر کرنا۔

ہاتھی دانت کی قیمت اس ہاتھی کے دانت گو بہت بڑے نہ تھے مگر منڈی کے ایک تاجر نے پھر بھی دونوں دانت ۵۰ ۹ روپیہ میں خرید لئے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ میں نے یہ ہاتھی پولس والوں کی معمولی رائفل سے شکار کیا تھا۔ جو صرف ۳۰۳ بور کی تھی

یورپین شکاری میں نے اس زمانے میں دیکھا کہ یورپین شکاری جھیل البرٹ اور نیل کے اس مغربی حصے میں جاکر جو بلجین حکومت کے تحت تھا۔ جس قدر چاہے ہاتھیوں کا شکار کرتے اور اُن کے بیش بہا دانتوں کی تجارت کرکے خاطر خواہ دولت پیدا کرتے۔

یہ علاقہ جس میں یورپین شکاری بے روک ٹوک شکار کرتے تھے اُس مقام سے شروع ہوکر جہاں دریائے نیل جھیل البرٹ سے ملتی ہوئی منصر کی سمت جانے کے لئے بجانب شمال مڑتی ہے۔ گونڈو کورو (لاڈو انکلا) تک یعنی یوگانڈا اور سوڈان کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ نیل کے ایک مغربی جانب کے حصے کو لاڈو انکلا (Lado enclave) کہتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام علاقہ ایک صلحنامہ کے بموجب اُس وقت کے بادشاہ "کنگ لیوپالڈ (King Leopold) کی وفات کے بعد سوڈان کو واپس کر دینا چاہیے اس لئے بلجین حکومت نے تمام مورچے برخواست کر دیئے تھے۔ مگر پھر بھی انگریز" اس

سرزمین سے استفادہ کا اپنے کو حقدار سمجھتے تھے اور اسی بنا پر اندگھس کر چوری چھپے شکار کرتے تھے۔

ہندوستان کو روانگی اور شکار کا اہتمام

اسی زمانے میں مجھے ہندوستان جانے کا لئے رخصت بھی مل گئی۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت جانا، کہ وطن بھی دیکھ آؤں گا۔ اور آئندہ کے لئے اپنے ذوق شکار کی تکمیل کے سلسلے میں جس ساز وسامان کی ضرورت ہوگی اُسے بھی مہیا کر لوں گا۔

چنانچہ میں منڈی سے روانہ ہو کر پہلے بمباسہ آیا یہاں میں نے تقریباً تمام ایسی اشیاء خریدیں جن کی شکار میں اور صحرائی زندگی میں ضرورت پڑا کرتی ہے۔ جیسے اچھے رائفلس۔ خیمہ۔ کیمپ، فرنیچر وغیرہ اس انتظام کی تکمیل کے بعد میں ہندوستان آیا۔ یہاں میرا تقریباً دو ماہ قیام رہا۔

پونہ کی سیر، چند آنسو، چند آہیں

اس قیام ہندوستان کے دوران میں اپنے دیرینہ اشتیاق سے مجبور ہو کر مہاراشٹر کے قدیم دارالحکومت پونہ آیا۔ میں بچپن ہی سے پونہ کی تعریفیں سنا کرتا تھا۔ کہ وہ مرہٹوں کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے۔ اُس کے باشندے غیر معمولی قابلیت، ذہانت، اور بلند اخلاقی کے حامل ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر، گجرات، احمد آباد، بڑودہ اور سورت وغیرہا سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ

دولت مند ہوگا۔

ایسی ہی حسن زنی تھی جس نے مجھے آمادہ کیا کہ وطن جانے سے قبل چند دنوں کے لئے پونہ میں ضرور قیام کرونگا۔ بمبئی پہونچکر میری ملاقات مشہور ہومیو پیتھک ڈاکٹر واسکر سے ہوگئی۔ انہوں نے ایک خط سری بت جوشی صاحب (پونہ) کے نام دیا۔ میں بمبئی سے روانہ ہوکر شب کو آٹھ بجے پونہ اسٹیشن پہونچ گیا۔ تانگہ کرایہ پر کرکے بدھ وار پیٹھ (جو اس شہر کا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے) کو روانہ ہوا۔ میرا سست تانگہ ایک ایسے راستے سے گزرنے لگا جس کے دونوں جانب پست مکانات تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، مگر مجھے تمام راستے میں ایک شاندار مکان نظر نہ آیا۔ چھوٹے چھوٹے بے رونق مکانات، جن سے افلاس ونکبت نمایاں تھی۔ اور جن میں سے اکثر چھپر والے مکانات بھی تھے جن پر گوبر کا پلاسٹر معلوم ہوتا تھا مگر دراصل وہ کویلو" چھائی ہوئی تھی۔ اثنائے راہ میں مجھے خیال ہوا کہ شاید میں ابھی اصلی شہر میں نہیں پہونچا ہوں یہ شہر کے کنارے کے مکانات دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اب آگے چلکر شہر کی شاندار آبادی شروع ہوگی۔ میں اپنے خیالات میں تھا کہ چلتے چلتے یکایک تانگہ رکا میں سمجھا کہ یوں ہی کسی ضرورت سے رگ گیا ہے مگر تانگہ والا بھی اتر پڑا اور کہنے لگا کہ حضور۔ بدھوار پیٹھ یہی ہے۔

اب میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی۔

سری بت جوشی صاحب نے اول تو اپنے ہی دولت کدے پر قیام کرنے کے لئے مجھ سے بہت اصرار کیا مگر درخواست پر انہوں نے ایک دوسرا الگ مکان مجھے دلا دیا جس میں میرا قیام رہا۔ دوسرے روز شہر میں گھوما۔ اس سلسلے میں نانو کا باڑہ بھی دیکھا۔ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پونہ کے متعلق میرے جتنے خیالات پہلے سے قایم تھے وہ ایک ایک کرکے سب غلط ثابت ہوئے۔ مجھے کسی طرح یقین بھی نہیں آتا تھا کہ پونہ" اتنا پست اتنا بے رونق اتنا غیر دلچسپ ہو سکتا ہے مگر اس کو کیا کروں کہ میں اس یقین پر مجبور تھا کیونکہ درحقیقت یہ شہر پونہ ہی تھا۔ مرہٹوں کی شان و شوکت کا مدفن!

مرہٹوں کی پست حالی

میں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ تجارت و کاروبار کے ذریعہ سے مرہٹہ قوم کی رہی سہی پونجی بھی، گجراتی، مارواڑی، بوہرہ، خوجہ اور برہمن لوگوں کے پاس جا رہی ہے۔

مرہٹوں میں اس کا احساس ہی نہیں کہ دنیا میں باعزت زندگی گزارنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہیئے ان میں جو بیدار ہوتا ہے اس کا مقصد حیات صرف ملازمت ہوتا ہے۔ ملازمت یعنی مہذب غلامی گروہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں تو وہ بھی کسی ملازمت ہی کے لئے

تجارت، صنعت وحرفت جو آزادی و ترقی کی شاہ راہیں ہیں ان پر کہیں بھول کر بھی نہیں چلتے۔ کوئی قوم جس نے ملازمت ہی کو اپنا نصب العین بنالیا ہو وہ کبھی معزز ہو سکتی ہے نہ دولت مند مرہٹوں کی موجودہ پستی ان کی پستی خیال کا نتیجہ ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مرہٹوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو عہد حاضر کی اعلےٰ ترین تعلیم سے آراستہ ہوئے ہیں مگر ان کے پیش نظر بھی کوئی بلند مقصد حیات نہیں ہوتا۔ ان کے دل و دماغ پر بھی کسی اعلیٰ ملازمت کا ہی خیال مستولی رہتا ہے۔

کسی آزاد پیشہ کی طرف اگر کسی نے رغبت بھی کی تو زیادہ سے زیادہ وکالت یا ڈاکٹری مگر یہ آزاد پیشے بھی برائے نام آزاد ہیں جس کی تہہ میں غلامی چھپی ہوئی ہے وہ کبھی وکیل یا ڈاکٹر منکر ہی اپنی قوم کی خوش حالی میں اضافے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ ان کو دنیا کی خوش نصیب قوموں کی طرح تجارت، صنعت وحرفت کی وادیوں میں نہایت مستعدی اور تیز گامی سے گرم رفتار ہونا چاہیے۔

کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ مرہٹہ قوم جس نے کسی زمانے میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنا مخصوص مقام آپ پیدا کیا تھا آج اسی پستی و ذلت میں پڑی ہوئی ہے اور اسے اس کا ذرا بھی احساس نہیں کہ دنیا کی دوسری پست قومیں کس طرح بام عروج پر پہونچکر داد حیات دے رہی ہے کیا اس کے لئے دنیا کے ان تغیرات و انقلابات میں کوئی

سبق اور کوئی بصیرت نہیں ؟

میں سری جت جوشی صاحب کے ساتھ اکثر دکن جمخانہ میں ٹینس کھیلنے جایا کرتا تھا وہاں متوسط اور اعلیٰ درجہ کے مرہٹے بھائیوں سے ملنے اور تبادلہ خیالات کا موقعہ حاصل ہوتا رہا۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اس قوم میں ابھی اور سچ مچ کی ترقی کرنیکا احساس بھی فنا ہوگیا ہے۔ میں کسی کے سینے میں بھی ترقی و عروج حاصل کرنے اور اپنی قوم کو موجودہ حالت سے نکالکر فلاح وبہبودی کی بلندیوں پر چڑھا ہوا دیکھنے کی تمنا نہیں پائی جا سکے۔ غلامی! ہائے ملازمت!!۔

ہندوستان سے افریقہ کو واپسی

ترک ملازمت

میں اپنے پروگرام کے بالکل مطابق دو ماہ ہندوستان میں رہنے کے بعد پھر آفریقہ واپس ہوا۔ ممباسہ آیا یہاں کی سرکار یوگانڈہ نے مجھے مشرقی صوبے کے مقام (MBALE) کے کلکٹریٹ میں بھیجدیا۔ میں یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں مسٹر جیکسن (JACKSON) اسسٹنٹ کلکٹر ہیں جو گوانی اہلکاروں میں اپنی فطری بداخلاقی اور بدمزاجی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اُن سے میرا سامنا ہوا تو انہوں نے مجھے بھی کوئی گوانی سمجھا اور مجھ سے بھی اُسی طرح پیش آنا چاہا۔ مگر میری جانب سے ترکی بہ ترکی جواب پاکر حیرت زدہ رہ گئے۔ معاملہ ذرا سنگین ہوگیا تھا۔ میں

بالکل آمادہ تھا کہ اگر یہ مجھ سے انسانیت سے پیش نہ آئے تو مجھے بھی انہیں ایک ایسا سبق دینا ضروری ہو جائے گا جسے شاید وہ تمام عمر کوشش بھی نہ بھلا سکیں۔ مگر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی ذہانت سے بروقت سب کچھ سمجھ گئے اور نہایت فراست اور انجام بینی سے کام لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی میرے پاس پھٹکے بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ قصداً مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میری اس کتاب کے قارئین بخوبی معلوم کر چکے ہونگے مجھے ملازمت سے قطعی نفرت تھی۔ میرا دل ملازمت میں مسرت محسوس کرتا تھا اور نہ اطمینان ایک مجبوری تھی جس نے مجھے میرے ضمیر، ارادہ، اور خواہش کے خلاف ملازمت سے داغدار بنا دیا تھا اس مرتبہ ہندوستان سے آتے ہی۔ میرے دل کی دنیا میں یکایک ایک ایسا موثر انقلاب ہوا جس نے مجھے قطعی مجبور کر دیا کہ میں پہلی فرصت میں اپنے گلے سے ملازمت کے طوق کو نکال کر پھینک دوں۔ بعض احباب نے مخالفت بھی کی اور کہا کہ اب تمہاری یافت ایک سو پچیس روپیہ ہے اور عنقریب تم اور ترقی کر دگے اور ایک ہندوستانی اس حکومت میں جس قدر ترقی کر سکتا ہے وہ ترقی تمہارے سامنے ہے۔ لہٰذا ملازمت ترک نہ کرو۔ چند سالوں کے بعد تم پنشن کے مستحق ہو جاؤ گے لیکن اس مرتبہ ترک ملازمت کا جذبہ کچھ ایسا قوی پیدا

ہوا کہ میں اسے کسی طرح دبا نہ سکا۔ اور میں نے اپنے بھی خواہ دوستوں کی مرضی کے بالکل خلاف ملازمت سے استعفا دے دیا۔ گو مجھے ابھی ہندوستان سے آئے ہوئے صرف ایک ماہ ہی بمشکل گزرا تھا۔ استعفا دینے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ابتک ایک متعفن، تاریک اور گھنونے غار میں پڑا ہوا تھا جس سے خدا نے مجھے نکالکر مجھ پر اپنی خاص عنایت مبذول فرمائی ہے۔

مستقل مشغلہ شکار —!

پھر منڈی کو۔ سابق اجازت نامہ کی رُو سے ابھی مجھے یہ حق حاصل تھا کہ اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور ہاتھی کا شکار کروں۔ چنانچہ میں اپنا نیا سامان شکار لے کر منڈی کو روانہ ہوا۔ یہاں سے نکلکر بگا نگہ پہونچا جو ہندی سوداگروں کی چھوٹی سی نوآبادی ہے۔ یہاں نہ کوئی سرکاری آفیسر تھا اور نہ پولیس کا تھانہ۔ سو، اتفاق سے میں یہاں پہونچتے ہی بلیک۔ واٹر مرض کا زندگی میں دوسری بار شکار رہوا۔ مگر یہاں نہ کوئی معالج نہ ڈاکٹر اور نہ علاج کا کوئی اور امکان۔ سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ گویا اس وقت موت میرے سامنے ناچ رہی تھی اور مجھے اشاروں سے اپنی جانب بلا رہی تھی۔

ایسے وقت میں مجھے خیال آیا کہ جب کوئی

شراب سے علاج ۔ دوا دستیاب ہی نہیں ہوتی تو لاؤ اسی دوا کا پھر ایک بار کیوں نہ تجربہ کروں جس نے گزشتہ منڈی کے زمانے میں مجھے اسپریم۔بخار سے ایسے نازک وقت میں نجات دی تھی جبکہ بخار کی انتہائی شدت سے میں انتہائی مضطرب اور بدحواس ہو گیا تھا اور میرے سینہ پر لاکھ من کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میری سانس رک رک جا رہی تھی اور گویا دم لبوں پر آچکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں ایک چائے کی پیالی میں کچھ حصہ برانڈی اور تھوڑا سا پانی ملا کر پی لیا تھا جس سے تھوڑی دیر کے بعد یہ محسوس ہوا کہ سینہ پر جو بھاری بوجھ ہے وہ اٹھ گیا ہے سانس نہایت سہولت وراحت سے رواں ہو گئی اور تمام جسم پر پسینہ آکر بخار بھی اتر گیا ہے

اس گزشتہ تجربہ کی یاد نے مجھے آمادہ کیا کہ وسکی یا برانڈی جو کچھ مل جائے اسے فوراً استعمال کر کے دیکھوں ممکن ہے کہ بلیک واٹر کا بھی شافی علاج ثابت ہو۔ بلیک واٹر میں بخار شدید ہوتا ہے اور انتہائی خطرناک اس کے ساتھ پیشاب کا رنگ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے ۔سیاہ تارکول کی طرح!! دل نہایت ہی کمزور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ دل کی حرکت یک لخت بند ہو رہی ہے ۔میں نے وسکی پینی شروع کر دی۔ واقعی اس نے فائدہ پہونچایا اور تین دن میں بخار بھی کم ہو گیا اور پیشاب۔

بھی صاف آنے لگا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے بخار اترنے کے بعد بھی مجھے اس مقام پہ ایک ہفتہ بغرض آرام رہنا پڑا۔

ایک ہفتہ آرام کے بعد۔؟ ایک ہفتہ کے بعد بگانگہ سے گکنڈاؤ پہونچا۔ یہ گاؤں نیل ندی کے کنارے آباد تھا۔

یہاں سے کشتی پر سوار ہوکر موبلی (بندرگاہ) کو روانہ ہوا۔ دراصل دریائے نیل کا آغاز بنجا سے ہوتا ہے یہاں سے گکنڈہ گاؤں کا فاصلہ ۸۰ میل ہے یہاں یہ ندی کیا گو جھیل سے ملتی ہے۔ یہاں پہونچکر میں نے رات گزاری۔ مگر یہ رات بیحد تکلیف سے گزری۔ کیونکہ اگر میں پانی میں کشتی وغیرہ پر رہتا ہوں تو مگر مچھوں کا خوف ہے اگر ساحل پہ رہتا ہوں تو زہریلے خونی مچھر ناک میں دم کرتے ہیں۔ جوں توں رات گزاری اور پھر دن بھر سرگرم سفر رہا۔ پھر یہ رات بھی ایک جزیرۂ رواں میں گزری۔ اس ندی میں کنول اور دیگر نباتات سے ڈھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے بہت سے جزیرے ہیں۔ میں نے شب جس جزیرے میں گزاری وہ زیادہ سے زیادہ ۵۰ فٹ مربع تھا۔ اس کی زمین سب کی سب دلدل تھی مگر میں نے پھر بھی خاص تدبیر سے کام لے کر آگ جلائی اور کھانا تیار کر ہی لیا آج رات میں کشتی میں مچھر دان لگا کر سویا۔ کیونکہ کنارے کہیں ایسی جگہ نہ تھی جہاں ڈیرہ نصب کیا جا سکتا

مختصر یہ کہ اسی طرح دن بھر چلتا اور رات کو کسی جزیرے میں بسر کرتا ہوا۔ مردلی پہونچا۔ یہاں میں نے دریائی سفر ختم کر دیا اور براہ صحرا چار یوم کی مسافت طے کر کے منڈی کے ایک پرگنے میں داخل ہوا جس کا نام چوپے تھا۔ یہ پرگنہ ہاتھیوں کی کثرت کے لئے مشہور تھا۔

سعی لاحاصل۔؟ ناکامی نما کامیابی۔۔۔؟!

مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ اس علاقہ میں ہاتھی آنے کی اطلاع ملی ۔۔ تیار ہو کر نکلا۔ جنگل میں پہونچکر مجھے ایک بہت بڑا ہاتھی دکھائی دیا جس کے دانت بہت بڑے بڑے تھے۔ اتنے بڑے دانت بہت کم ہوتے ہیں۔ جس مقام پر ہاتھی تھا وہاں درخت اور گھاس بھی کم تھی۔ میں نے ۱۰۰ گز کے فاصلے سے گولی چلائی لیکن ہاتھی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ تیزی سے دوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس کا دور تک پیچھا کیا اور جب جب طرف دل نے شہادت دی اس کی تلاش میں نکلا مگر ناکامی رہی۔ آخر کار میں واپس ہوا اور اپنا کیمپ لے کر آگے روانہ ہوا۔ ۵-۶ روز کے بعد اطلاع ملی کہ میں نے جس جگہ گولی چلائی تھی اس کے قریب میں ایک ہاتھی مرا پڑا ہے۔ میں خبر پاتے ہی چلا تو واقعی ایک ہاتھی مرا ہوا پڑا تھا

اوس کا جسم سڑ گیا تھا اور تعفن سے تمام فضا ناقابل تحمل ہو رہی تھی۔ اب اس ہاتھی کے مارنے کے کئی مدعی نکل آئے۔ اس انتظار میں وہاں بیٹھا رہا کہ اگر گولی نکل آئے تو اسے دکھا کر دوسروں کو قایل کروں کہ یہ میری گولی ہے مگر گوشت کے اس بھاری انبار میں جو سڑ کر پھول بھی گیا تھا گولی کا ملنا آسان نہ تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ کاش میں نے یہاں سے واپس ہوتے ہوئے اس حصے کے رہنے والوں کو کیوں نہ اس امر کی اطلاع کر دی ہوتی کہ میں نے ایک ہاتھی پر گولی چلائی ہے اگر وہ کہیں گرا پڑا مل جائے تو مجھے اطلاع کر دیں مگر میں نے ایسا نہیں کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اپنی کاوش کے ثمرہ سے محروم رہنا پڑا۔ مجھے اس ناکامی کا بیحد صدمہ ہوا۔ یہ ہاتھی دانت کسی طرح بھی تین چار ہزار روپیہ سے کم مالیت کے نہیں تھے۔ میری تمام آرزوں پر پانی پھر گیا اب میرے لئے یہی مناسب تھا کہ صبر کر کے دوسرے شکار کی تیاری کروں کیونکہ جب وہ ہاتھی میرا مارا ہوا تسلیم ہی نہیں کیا گیا تو مجھے ایسے اجازت نامہ کی رو سے ایک ہاتھی کے شکار کرنے کا حق باقی تھا۔ میں عالم دیوانگی اور پریشانی میں بھاگا تاکہ بقیہ مدت کے اندر جس طرح بھی ممکن ہو ایک بڑے دانتوں والے ہاتھی کا شکار کر لوں۔ تاکہ آیندہ کے مصارف شکار کی تلافی کر سکوں۔ ہاتھی کے شکار میں ایک تجربہ کار

رہبر کی بہرحال بیحد ضرورت ہے۔ مذکورہ بالا شکار میں میرے ساتھ کوئی ہوشیار رہبر نہ تھا ورنہ مجھے اتنے عظیم نقصان کا زخم اپنے دل پر نہ لینا پڑتا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا مجھے مستقبل کی فکر نے ستانے میں زیادہ بیدردی سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس دوران میں مجھے ہاتھیوں کے آنے کی اطلاعیں ملتیں اور میں اکثر پُرامید دل لیکر شکار کے لئے بھی جاتا اور مگر ناکام ہی لوٹتا۔ ان مہم ناکامیابیوں نے ہمت پست کرنی چاہی مگر میں نے اپنے کو بہت سنبھالا۔ اجازت نامہ کی مدت کے اختتام کو اب صرف ایک ماہ باقی رہ گیا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوی یہی مواقع ہوتے ہیں جب انسان نذر اور منتیں مانگتا ہے۔ میرے لئے گویا اس کا موقعہ آگیا تھا کہ میں بھی پنڈھرپور کے وٹھوبا، یا کولھاپور کی رتنا بائی کی منت مانگوں۔ مگر میں ذرا اس خام اعتقادی کا بہت کم عادی ہوں۔

میں نے ایک آنجہانی انگریز شکاری کے ملازم سے یہ سنا کہ اُس کا صاحب جب شکار کے لئے جاتا تو وہ کچھ دیر زیر فلک ننگے سر کھڑا ہوکر اپنے آسمانی باپ سے دعائیں مانگ لیا کرتا۔

کامیاب شکار میں اس کشمکش کے دن کاٹ رہا تھا کہ ایک روز منہ اندھیرے، ایک شخص میرے پاس آیا اور اُس نے ہاتھی کے آنے کی خبر دی۔ میں ابھی اٹھنی سوکر اٹھا تھا،

فوراً کپڑے پہن کر اور بندوق لے کر چلتا بنا۔ دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے چلتے میں اُس مقام پر پہونچا جہاں ہاتھی کا پتہ بتایا گیا تھا۔ آج میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ گویا میں عزم مصمم کر لیا تھا کہ آج خواہ مجھے اپنی جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ میرے لئے لازمی ہے کہ میں بڑے دانت کے ہاتھی کا شکار کروں۔ اس وقت میرے دل سے ہاتھی کا خوف بالکل نکل چکا تھا۔ اور موت بھی میرے لئے کچھ زیادہ ہیبت و پر وحشت نہیں تھی۔ یہ مقام چٹیل نہیں بلکہ لمبی لمبی گھاس کا گھنا جنگل تھا۔ میں نے دیا سلائی جلائی اور اُس کے دھوئیں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگایا۔ اور درختوں کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے یہ قیاس کیا کہ اب میرے اور ہاتھی کے درمیان ۵۰ - ۶۰ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔

میں اس اندازہ سے بندوق چلائی کہ گولی داہنی بغل میں کلیجے کے قریب لگے۔ بندوق کی آواز بھی آئی لیکن ہاتھی پر بظاہر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ دوڑ کر یکایک نگاہوں سے ایسا اوجھل ہو گیا جیسے اُس کو گولی لگی ہی نہیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ اُس کے بعد جو بندوق پر میری نظر پڑی تو دیکھا کہ اُس کی (Sight) نشانہ لگانے سے قبل اوپر چڑھائی نہیں گئی تھی۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ میں نے جو نشانہ تاکا تھا گولی اُس پر لگنے کے بجائے نیچے کی جانب نکل گئی اور ہاتھی پر کچھ اثر انداز نہیں ہوئی سچ ہے کہ

بدحواسی اور پراگندہ دماغی کے عالم میں جو کام کیا جاتا ہے وہ بگڑ ہی جاتا ہے ہاتھی نگاہوں سے تو اوجھل ہو ہی گیا تھا۔ مگر پھر بھی اُمید کی خفیف سی دل میں گرمی باقی تھی۔ اسی گرمی کے اثر سے میں پھر بھی ہاتھی کے تعاقب میں نکلا کوئی میل ڈیڑھ میل جانے کے بعد، راستے میں تازہ خون ٹپکا ہوا ملا۔ جو اس کا ثبوت تھا۔ کہ ہاتھی زخمی ہو کر ادھر سے بھاگا ہے۔ میری پژمردہ امیدوں میں کچھ تازگی پیدا ہوگئی۔ گو زخمی ہاتھی کا تعاقب انتہائی خطرناک ہے۔ تاہم میں بلا خوف اُس کے تعاقب اور تلاش میں سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ اب میں تھک کر بالکل چور چور ہوگیا تھا۔ ایک مقام پر ٹھیر کر نصف گھنٹہ کمر سیدھی کی۔ پھر اٹھ کر تلاش میں نکلا۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہونچا جہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر ہاتھی کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسوقت میں نے محسوس کیا کہ ہوا ہماری جانب سے ہاتھی کی جانب جا رہی ہے۔ میں نے آگے جانا ضروری نہیں خیال کیا بلکہ اسی مقام سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں تاک کر چلائیں ہاتھی پلٹ کر نہایت تیزی سے پھر غائب ہوگیا۔ میں پھر اُس کی تلاش میں چلا۔ دو گھنٹوں کی سرگردانی کے بعد وہ ایک درخت کے نیچے نہایت اطمینان سے کھڑا ہوا نظر آیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ فاصلہ پر کھڑا ہوگیا۔

اس میں کلام نہ تھا کہ ہاتھی زخمی ہو چکا تھا۔ ایسے مجروح

ہاتھی کے قریب جانا خطرے سے خالی نہیں اس لئے میں تقریباً ۴۰ گز ہی کی دوری پر ٹھہر گیا اور ایک اونچے درخت پر چڑھ کر تابڑ توڑ تین گولیاں چلائیں مگر اس کا علم نہیں ہوا کہ یہ گولیاں اُس کو لگی یا نہیں ؛ ہاتھی اب بھی ویسا ہی کھڑا تھا میرے دوسرے ساتھی اور بندوق بردار بھی درختوں پر چڑھ کر ہاتھی کے گرنے کا انتظار کرنے لگے۔ بہت دیر کے بعد ہاتھی خود بخود گرا پھر سنبھل کر کھڑا ہوا پھر گرا پھر کھڑا ہوا۔ پھر گرا ایسا کہ کھڑا ہی نہ ہو سکا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اس ہاتھی کے دانت کا جوڑا (۱۳۰۰ روپیہ) میں فروخت ہوا۔

نئے اجازت نامہ کا حصول اور خطرناک شکار کے مناظر

ان تیرہ سو روپیہ میں سے ساڑھے سات سو روپے داخل کر کے میں نے نیا اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس نئے اجازت نامہ کے تحت مجھے دو ہاتھیوں کے شکار کا حق حاصل ہوا حسن اتفاق سے میں نے ایک مہینے میں یہ دونوں ہاتھی مار لئے۔

مجھے شکار کرتے کرتے اور دوران شکار میں عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوتے ہوتے کافی تجربہ ہو گیا۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ہاتھی ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دوسرے درختوں کی آڑ میں سے بندوق سمیت کھسکتے کھسکتے بالکل اسی درخت کے پاس پہونچ گیا۔ ہاتھی مجھ سے چند

فٹ ہی پر تھا۔ میں نے قیاس کیا کہ اگر اسی مقام پر ٹھیر کر دو تین فٹ کی دوری سے نشانہ لگایا جائے۔ تو گولی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی اُس کے کلیجے میں در آئے گی۔ اس خیال کے تحت میں نے بندوق اٹھائی اور اب گولی چلانا ہی چاہتا تھا کہ یکایک ہاتھی نے سر نکالا اور تیزی سے میرے سامنے سے روانہ ہو گیا۔ میں حیران و ششدر رہ گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں اُس کی پشت کی جانب ہوں مگر میں جدھر پشت سمجھا تھا اس کا سر نکلا۔ میں نے جی کڑا کر کے پھر بھی گولی چلا ہی دی جو معلوم نہیں اُس کے کس حصے میں لگی کیونکہ وہ گھبرا کر اس تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ میری نگاہ کام نہ کر سکی۔ یہ بھی خدا کا خاص فضل ہوا ورنہ اگر ہاتھی پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیتا تو پھر میری زندگی کا خاتمہ ہی تھا۔ غور کیجئے کہ یہ شکار کس قدر پر خطر تھا۔ میں نے چند میل تک اس کا تعاقب کیا۔ راستے میں کہیں کہیں ہاتھی کی تازہ لید دیکھنے میں آئی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ادھر سے گزرا ہے۔ مگر کافی تجسس اور دوڑ دھوپ کے بعد بھی اُس کا پتہ نہ چلا میرے تجربہ کار رہبر نے کہا کہ اب مزید تعاقب و جستجو بیکار ہے۔ کیونکہ ہاتھی کو کوئی سخت ضرب نہیں آئی۔ بالآخر میں ہمراہیوں سمیت واپس آگیا۔

ہاتھیوں کے ہجوم میں

ایک مرتبہ میں شکار کے لئے ایک ایسے جنگل میں جو بہت لمبی لمبی اونچی اونچی گھاس سے بھرا ہوا تھا اور اتنا گنجان کہ خدا کی پناہ آدمی کا گزر

محال تھا۔ البتہ کہیں ہاتھیوں کی آمد و رفت سے راہیں سی بن گئی تھیں۔ جن پر گزر بدقت ممکن تھا۔ میں نے ایک درخت پر چڑھ کر دیکھا کہ فاصلے پر بہت سے ہاتھی گھاس چرنے میں مصروف ہیں لیکن اتنی دور سے ہاتھیوں کی واقعی تعداد، اور اُن کے صحیح رخ کا اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے میں درخت سے نیچے اُتر کر ہاتھیوں کی پامال کی ہوئی راہ چلا۔ میں بائیں جانب تھا اور ہاتھیوں کی ٹولی داہنی جانب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ابھی مجھے چلے ہوئے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ گھاس کی غیر معمولی سرسراہٹ سے میں نے قیاس کیا کہ دو متفرق ہاتھی۔ ایک ساتھ ہو کر گنجان گھاس میں گھس کر چل رہے ہیں۔ مگر گھاس بہت ہی گنجان اور لمبی تھی جس سے اُن کی رفتار، اور رُخ رفتار کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو سکا۔ میں نے چاہا کہ آس پاس کوئی اور درخت مل جائے جس پر چڑھ کر گھاس میں چھپ کر چلنے والے ہاتھیوں کو دیکھ سکوں۔ مگر افسوس کہیں قریب کوئی ایسا درخت بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہاتھیوں کے گھاس میں گزرنے کی آواز بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ صرف آواز ہی کا احساس ہو رہا تھا، مگر ہاتھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس لئے یہ موقعہ نہایت خطرناک ہو گیا تھا۔ کہ کہیں ہاتھی بالکل میرے سامنے ہی نہ نکل آئیں اور یکایک مجھے سونڈ میں لپیٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اب میں سخت کشمکش میں تھا نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ہاتھیوں کے پاؤں کی آہٹ

بتدریج قریب سے قریب تر محسوس ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے وقت میں میرے لئے سوا اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ میں اور میرے ساتھی اپنی اپنی بندوقیں چلائیں۔ اس وقت ہمارے پاس چھ بندوقیں تھیں ہم سب نے آواز کی سمت پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اب آوازیں اور زیادہ تیز اور زیادہ قریب محسوس ہونے لگیں بلکہ یہاں تک دکھائی دینے لگا کہ ہاتھیوں کی سونڈوں کے سرے۔ ہمارے قریب کی گھاس کی سطح پر حرکت کر رہے ہیں۔ اور انسانی بو محسوس کر رہے ہیں۔ اب ہاتھی ہم سے زیادہ ۲۰۔ ۲۵ فٹ پر ہوں گے۔ ہمارے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم کسی جانب بھی بھاگ سکیں۔ مگر ہم نے اس میں خیریت محسوس کیا کہ متواتر گولیاں چلاتے جائیں۔ ہمارے اس پیہم عمل سے ہاتھیوں نے اپنا رخ بدل لے۔ اور وہ بجائے ہماری جانب بڑھنے کے دوسری جانب مڑ کر روانہ ہو گئے۔ ورنہ اگر وہ اپنے پہلے رخ پر ہی روانہ ہوتے تو ہم سب ان کے پاؤں سے دب دب کر سرمہ ہو گئے ہوتے۔ ہم نے اندھی گولیاں چلائی تھیں۔ ان میں سے کچھ نہ کچھ ہاتھیوں پر بھی پڑی ہی ہوں گی۔ مگر کوئی جانور مردہ یا زخمی نہیں دکھائی دیا۔ چونکہ یہ ساری گولیاں محض قیاس اور اندازہ ہی پر چلائی گئی تھیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ گولیاں بے ٹھکانے لگی ہوں۔

ہاتھیوں کے ہجوم میں ہماری یہ کاوش و کوشش گو بے نتیجہ ہی ثابت

ہوئی مگر اس سے ہماری جراتوں میں اضافہ ہوا۔

کان کے پاس سے گولی...! ایک مرتبہ میں شکار کو گیا۔ جنگل میں ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوا جہاں سے میرے ساتھی کچھ پیچھے تھے اور میرے سامنے کچھ فاصلے پر ہاتھی تھا۔ میں نے گولی چلائی۔ مگر ہاتھی صاف بچکر نکل گیا۔ میری آنکھیں بھاگتے ہوئے ہاتھی کے نظارے میں مصروف تھیں۔ کہ یکایک ایک گولی میرے کان کے پاس سے "سن" سے نکل گئی۔ خدا کا خاص فضل ہوا کنپٹی یا سر کے کسی حصے میں گولی نہیں لگی۔ میں نے موڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بندوق بردار نے یہ گولی چلائی جو مجھ سے پیچھے کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس کا مقصد غالباً بھاگتے ہوئے ہاتھی پر نشانہ لگانا تھا۔ مگر میں اس نشانے کی زد سے بال بال بچ گیا۔ اس سانحہ سے میرا دل بہت پریشان ہوا اور دماغ پر عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوی۔ اس عالم ہیجان و اضطراب میں میں نے مفرور ہاتھی کا تعاقب کیا۔ گھاس بہت گنجان اور لمبی تھی مگر میں برابر آگے بڑھتا جاتا تھا اتنے میں مجھے کچھ فاصلہ پر ہاتھی کا سر اور سونڈ نظر آیا۔ میں اور میرے ساتھی اس مقام پر رک گئے۔ اور اب جو بندوق اٹھا کر نشانہ لگانا چاہتا ہوں تو سامنے سے ہاتھی غائب و خیال ہوا کہ شاید ہاتھی بڑھ گیا ہو میں بھی آگے بڑھا۔ اور ادھر اُدھر تمام چھان ڈالا مگر کہیں ہاتھی کا وجود بھی نہ تھا۔

خدا جانے یہ کیا ماجرا تھا۔ یا تو میرا یہ سب تخیل کی فریب کاریاں

ہیں۔ قوت خیالیہ کی شدت نے ایک موہوم ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ یا کیا؟ جس طرح بعض بھگتوں کو ہنو مان کے درشن ہو جایا کرتے ہیں شاید اسی طرح مجھے گنیش جی کے درشن نصیب ہو گئے۔

کانگو کو (براہ منڈی) روانگی

میں اس نئے اجازت نامہ کی رو سے دو ہاتھیوں کا شکار کرسکتا تھا۔ دونوں شکار کر ہی چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ میں کانگو جاؤں اور اُس علاقے میں دیگر یورپین شکاریوں کی طرح میں بھی شکار کروں۔ اس مقصد سے میں روانہ ہوا منڈی ہوتا ہوا اور پیدل راستہ طے کرتا ہوا انجانگو پہونچا یہ بہت ہی دلکش اور پرفضا مقام ہے یہاں دریائے نیل بہت بلندی سے گرتا ہے۔ اس دلنواز اور نظر فریب آبشار کا نام مرچیسن فال ہے اس کی آواز پانچ چھ میل کی دوری سے سنائی دینے لگتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ آبشار ایسی جگہ واقع ہے جہاں کسی کا گزر آسان نہیں، تاہم نایل کے کنارے کنارے پہاڑ کی چوٹی تک ایک تنگ راستہ بنا دیا گیا ہے جس پر لوگ پیدل جاکر اس رنگین و خوش منظر مقام تک پہونچ جاتے ہیں۔ اس راہ پر چلتے وقت ایک جانب پہاڑ کی سربفلک چوٹی ہے اور دوسری جانب نیچے گہرائی میں نایل ندی کے آبشار سے گرا تیزی سے بہنے والا صاف شفاف پانی۔ اس پانی کی سطح میں لاتعداد مگرمچھ ہیں جو اپنے سر اوپر کو نکالے ہوئے نہایت آزادی سے تیرتے

پھرتے ہیں۔ یہ منظر خوش نما ہونے کے ساتھ انسانی قلب پر غیر معمولی ہیبت بھی طاری کر دیتا ہے۔

منجاؤ سے میں بذریعہ کشتی کوبے پہونچا۔ یہاں برٹش گورنمنٹ کا ڈسٹرکٹ آفس (دفتر ضلع) تھا۔ یہاں سے ایک روز کی مسافت طے کر کے وڑلائی پہونچا جہاں سے مذکور الصدر مقام کوبے کو دفتر ضلع منتقل کیا گیا تھا۔

بلجین علاقے میں شکار

وڑلائی سے بلجین حکومت کی سرحد ملحق تھی اور اس سرحد کو عبور کرنا بھی "یا" دشوار نہ تھا۔ مگر ایک خیال بار بار آ رہا تھا۔ وہ یہ کہ بلجین علاقے میں ایک اجنبی ہندوستانی شخص کا اس غرض سے جانا کہ وہاں کے ہاتھیوں کو شکار کر کے اُس ملک کی زندہ دولت یعنی ہاتھی دانت حاصل کرے خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی حکومت ہی نہیں ہے اور مطلقاً کسی کی داد فریاد سنی ہی نہیں جاتی یہاں کے لوگ بھی انتہائی ظالم اور سفاک ہیں اور عام باشندے وحشت و زندگی اور خونریزی میں اپنی آپ مثال ہیں اس علاقے میں جانے کے معنی سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ سوئی ہوئی بلاؤں کو پھر جگایا جائے اور ان دیکھے مصائب سے دوچار ہو کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھویا جائے لیکن میں ارادہ کر ہی چکا تھا کہ مجھے اس علاقے میں جانا ضروری ہے اور وہاں شکار کے ذوق کی تکمیل بھی لابدی ہے۔ اس لئے دور اندیشی اور مال بینی

میرے پختہ عزم کو مغلوب نہ کر سکی۔

اس وقت میرے ساتھ مزدور، بندوق بردار، رہبر وغیرہ ملا کر کل ۱۶ نفر تھے۔ اور کافی ساماں و اسباب بھی ساتھ تھا۔ خدا کا نام لیکر نامل ندی کو عبور کیا اور بلجین حکومت کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ہم سب پیدل تھے چلتے چلتے ۵-۶ گھنٹے گذر گئے تھے۔ اس قدر چلنے پر سامنے ایک گاؤں دکھائی دیا۔

خونخوار وحشیوں کے محاصرے میں

ہم لوگ کافی تھک چکے تھے اس لیے زیادہ چلنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی یہی مناسب سمجھا گیا کہ سردست یہیں قیام کرنا چاہیئے چنانچہ اس گاؤں کے نزدیک ایک سایہ دار درخت کے نیچے اتر پڑے مزدوروں نے آدھے گھنٹہ میں میرا خیمہ وغیرہ نصب کر دیا اور میرے تمام ضروریات کی تکمیل بھی کر دی۔

میں اسی خیمہ کے سامنے ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور تھکن دور کرنے کے لئے میں نے سوڈا شریک کر کے وسکی کا ایک جام چڑھا لیا۔ مزدور میرے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے قیام کے لئے جھونپڑی وغیرہ ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس گاؤں کے لوگ آہستہ آہستہ آنے لگے۔ اور میرے ڈیرے کا گویا محاصرہ کرنے لگے۔ ان کی صورتیں اور وضع قطع انتہائی خوفناک تھی۔ ان کو دیکھکر دل پر وحشت طاری نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ پھر یہ سب کے سب مسلح بھی تھے

اگر میں ان لوگوں کی سیرت اور کردار سے یہاں آنے سے قبل ہی واقفیت حاصل نہ کر چکا ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ یہ سب ایک نئے مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

جوں جوں اُن کی تعداد بڑھتی جاتی میری وحشت اور خوف میں اضافہ ہوتا جاتا۔ میں اپنے ساتھ اس صحرائی علاقے کے باشندوں کے مذاق و ضرورت کی بہت سی چیزیں خرید کر اس غرض سے لایا تھا کہ ان کے بدلے میں ان لوگوں سے اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کروں گا یہ لوگ نقد سکہ کی کچھ قدر نہیں جانتے بلکہ پیتل تانبے کے تار امیٹیشن کے نگ، مختلف رنگ کے کانچ کے دانے اور لڑیاں چمکنے دمکنے والے مصنوعی دھاتوں کے زیورات شیشے اور رنگین چینی کی چیزیں یہ اشیاء ان لوگوں کو مرغوب ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کی چیزیں میں بھی لایا تھا اور وہ سامنے خیمے میں ہی رکھی ہوئی تھیں یہ لوگ لحظہ بہ لحظہ مجھے اور میرے خیمے سے قریب سے قریب ہوتے جا رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ محاصرہ کو درجہ بدرجہ مضبوط بناتے جا رہے ہیں اور ایک بارگی مجھ پر اور میرے خیمے پر حملہ کر دیں گے۔ میں کچھ زمانہ پیشتر ہی یہ خبر سن چکا تھا کہ ان لوگوں نے ایک اطالوی شکاری کو جس کا نام بکیری (Buccire) تھا۔ نہایت بیدردی سے قتل کر کے اس کا سارا سامان لوٹ لیا تھا مجھے بھی اپنا حشر ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔

یہ لوگ برابر میری طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ جوں ہی ان کی نگاہ میرے لائے ہوئے سامان پر پڑی تو ان کی نگاہوں سے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ نہایت بے صبری سے دیکھ رہے ہیں اُن میں سے کچھ لوگوں نے ان چیزوں کو طلب بھی کیا۔

ان کی زہریلی نگاہیں اُن کے بے باک تیور یہ کہہ رہے تھے کہ یہ اپنے اوپر کسی طاقت اور قوت کو محسوس ہی نہیں کرتے اور نہ ان کو انسانی جان وخون کی قیمت کا علم ہے۔

ان کے ہاتھ اور جسم مختلف آلات قتل وجراحت سے آراستہ تھے اور کسی کو مار ڈالنا ان کے لئے معمولی دل لگی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ان کا یوں ہجوم کرنا، اور پھر ایک خاص انداز پر میرے خیمے اور خود مجھکو یوں محاصرہ میں لے لینا میرے لئے بیحد پریشان کن تھا۔ کیونکہ اول تو ان کی تعداد ہم سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے یہ کہ ہم لوگ بالکل اجنبی اگر ان کے حملوں کا جواب بھی دیں تو خدا جانے ہم کو اور کن مصائب میں مبتلا ہونا پڑتا — غرض ہمارے لئے ایک عجیب صورت تشویش تھی۔ اس وقت مجھے اس کا بہت خیال تھا کہ حتی الامکان میری جانب سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے اس محروم العقل وتہذیب درندہ منش وحشی گروہ کو غضبناک یا مشتعل ہونے کا موقعہ ملے۔ یہ بآسانی ممکن تھا کہ میں ان کے مذاق کا جتنا سامان لایا ہوں سب ان کو دے دوں یہ خوش خوش چلے جائیں گے اور آپس

میں تقسیم کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال تھا کہ اس کے بعد میں بالکل تہی دست ہو جاؤں گا اور میرے پاس اس علاقے میں رہ کر قوت لایموت بھی فراہم کرنیکا کوئی امکان نہ رہیگا۔

میں اسی کشمکش میں تھا کہ یکایک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ یہ کہ اگر ان سے مقابلے ہی کی ٹھن جائے تو مجھے بھی پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے۔ بہرحال ان سے مقابلہ کرنا ہی مصلحت ہے۔ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دینا اس خیال سے بھی مصلحت نہیں ہے کہ یہ لوگ سب کچھ لے لینے کے بعد میں اگر ہماری جانیں بھی لینا چاہیں تو ان کو کونسی معقولیت اس ارادے سے باز رکھ سکتی ہے۔ اور کونسا قانون مانع ہو سکتا ہے میرا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ یہ لوگ تیر و کمان کے فن میں بالکل کچے ہیں۔ ہندوستان کی وحشی بھیل قوم کی طرح یہ تیر اندازی میں کمال نہیں رکھتے۔ لہذا اس موقع پر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

اب جب کہ وحشیوں میں اور ہم میں کچھ بھی فاصلہ نہ رہا تھا میں اٹھا اور چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کھڑا تھا اس کے تنے پر ایک کاغذ لگا کر آنے کے بعد وحشیوں کے ایک آدمی سے جو بظاہر اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر اشاروں میں کہا کہ اسے تیر کا نشانہ بناؤ۔ وہ راضی ہو گئے۔ اُن کے تین چار آدمیوں نے کوشش کی متعدد تیر چھوڑے۔ لیکن کوئی بھی تیر نشانہ

پر نہ لگا۔ اس پر میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں روک دیا اور اسی کاغذ کو وہاں سے زیادہ فاصلے پر ایک گھنا تھوہر کا درخت مثل تاڑ کے تھا اس کے تنے پر لگا کر اپنی جگہ پہ آیا میرے پاس ایک امریکن بندوق تھی۔ جس میں ایسا کارتوس استعمال کیا جاتا تھا جو چلنے کے بعد لگ کر پھیلتا تھا۔ چنانچہ میں نے وہ بندوق لی اور اس سے نشانہ لگایا گولی کاغذ میں لگ کر تنے میں گھس گئی۔ تھوہر کا درخت بہت نرم ہوتا ہے۔ اس نے تنے کو چھنی کر دیا اور اس کے لئے شاخوں کا وزن سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ ایک زبردست آواز کے ساتھ تنے سے اوپر کا حصہ نیچے آ رہا۔ میں وحشیوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا کہ ان پر اس آواز سے خوف طاری ہے اس موقعہ سے میں نے فائدہ اٹھایا اور جو وحشی میرے قریب ہی کھڑا تھا اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اور انتہائی غیض کی حالت میں دوسرے کی طرف لپکا۔ مجھے غضب ناک دیکھ کر وحشی بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر کوئی ہمارے قریب نہ آیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح وہ رات گزار کر دوسرے دن علی الصباح اپنا کیمپ اٹھا کر وہاں سے چلتا بنا۔

ہاتھیوں کے جنگل میں

خدا خدا کر کے دوسرے روز ہم ایک ایسے گاؤں میں پہنچے جسے قدرت کی نوازشوں نے انتہائی سرسبز اور شاداب بنا رکھا تھا جل تھل پانی لہلہاتے ہوئے درختوں اور ہری ہری گھاس کی وجہ سے درندوں پرندوں اور چرندوں نے آس پاس اپنا اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ بورو کی گھاس جو ہاتھیوں کی خاص غذا ہے کثرت سے اُگی ہوئی تھی۔ جس کے لئے ہاتھی غول در غول آتے رہتے تھے۔ شکار کے شوق میں تو ہم نکلے ہی تھے اس لئے۔ ع

ٹھہر پائے طلب! منزل یہیں معلوم ہوتی ہے

کہکر اسی مرغزار میں آبادی سے کچھ دور کھلے اور پر فضا مقام پر ہم نے اپنا ڈیرہ اجاد یا اور ایسا کچھ اہتمام کیا کہ گاؤں کا ایک شخص بھی ارد گرد پھٹکنے نہ پائے۔ ابھی دو دن بھی گذرنے نہ پائے تھے

کہ ہمارا مجرّ آیا اور اپنے ساتھ یہ خوشخبری لایا کہ پاس کے جنگل میں بہت سے ہاتھی آئے ہیں یہ سنتے ہی خوشی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ فوراً بندوق اور کارتوس لیکر اپنے آدمی کے ہمراہ جھاڑ جھنکار کو دتے پھاندتے ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر دیو پیکر ہاتھیوں کے منڈے کے قریب ہی پہنچ گیا۔

میرا پہلا شکار

دوسرے جانوروں کی طرح ہاتھی بھی جنگل میں چرنے کے لئے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری سمت جاتے وقت سب یکجا ہو جاتے ہیں اور پھر قیادت کرنے والا ہاتھی جس سمت چلنے لگتا ہے اسی سمت اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ شاید ہماری بو کی وجہ سے ہمارے آنے کا ان کو احساس ہو گیا ہو اور سب جمع ہو کر ہمارے بائیں جانب جاتے ہوئے دکھائی دئے۔ بڑے دانت کے ہاتھی جو صف اول میں چل رہے تھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے موقعہ غنیمت سمجھتے ہوئے قدم بڑھا کر پھرتی سے دو ہاتھیوں پر فر کیا۔ ایک ہاتھی اگلے دو قدموں پر گر کر اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر ادھر اُدھر بازو پھیرنے لگا میں نے جلد جلد اور کئی فیر کئے تاکہ سنبھل کر بھاگنے نہ پائے

ہاتھی گر گیا اور میں اپنے اس علاقے کے پہلے شکار پر خوشی سے جھومتا ہوا بھاگے ہوئے گروہ کے تعاقب کے لئے آگے بڑھا تو ۵۰ گز کے فاصلہ پر دوسرا ہاتھی بھی مرا ہوا نظر پڑا جو پہلے گھائل ہو چکا تھا ایک ہی دن میں دو ہاتھی ملنے کا موقعہ شکاری کو بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی تھی۔ جاتے وقت تو افتاں و خیزاں گیا تھا لیکن واپسی میں انتہائی مسرت سے خراماں خراماں تقریباً بیتن بجے تک اپنے ڈیرے میں واپس آگیا۔ کھانا کھا کر تھکن دور کرنے کے لئے کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔

مجھے مبارکباد دی شام کے وقت میری اس کامیابی کی خبر سنکر پیرس نامی ایک شکاری بھی آکر میرے خیمے کے قریب ہی خیمہ زن ہوا۔ وہ بیچارہ کئی ماہ سے اس علاقہ میں شکار کر رہا تھا لیکن کسی روز بھی اُسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجھ پر انتہائی رشک ہوا۔ باوجود اس کے اُس نے ایک ہی دن دو بڑے دانت والے ہاتھی ملنے پر مجھے مبارکباد دی اس سے میری ہمت افزائی ہوئی اور شکار کا اسٹاک پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ اس شکاری کے پاس ایک دو نلیوں والی ایک بہترین رائفل اس کی زائد تھی جس کی قیمت تقریباً سات یا آٹھ سو سے کسی طرح کم نہ تھی

اس کو میں نے بنا بر ضرورت دو دانتوں کے عوض حاصل کر لیا اور سمجھا کہ بہت سستے داموں حاصل ہو گئی مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سودا سستا نہیں بلکہ بہت مہنگا پڑا ہے کیونکہ اس وقت ایسے دانتوں کی قیمت اٹھارہ سو اور دو ہزار کے درمیان تھی آدمی کو کسی چیز کی قیمت معلوم نہ ہو یا کوئی چیز بہ آسانی حاصل ہو جائے تو اس کی زیادہ قدر نہیں کرتا۔ بلکہ بسا اوقات لعل کو بھی پتھر کے بھاؤ بیچ دیتا ہے۔ چونکہ ہمیں یہ تھوڑی ہی محنت سے حاصل ہوئے تھے۔ کم قیمت پر فروخت ہونے سے ہمیں کچھ زیادہ رنج نہ ہوا۔

ٹیرسن کی طرح اور دس پندرہ شکاری اس لارڈ انکلاؤ میں ہاتھی کا شکار کر کے ہاتھی دانت حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایک جرمن ایک اطالوی اور ایک ہندوستانی کے علاوہ باقی سب انگریز تھے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریز کس طرح زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد روزانہ جنگل جانا اور شکار کی جستجو کرنا میرے معمول میں داخل ہو گیا۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اس نواح میں درندے پرندے اور چرندے کثرت سے پائے جاتے ہیں، جگہ جگہ جنگلی بھینس اور گینڈے بہت ملتے تھے لیکن میں نے ان کا شکار کرنا اور کارتوسوں کو بیکار کرنے کے مترادف سمجھا۔ صرف ہاتھی

کے شوق میں اپنے قیام گاہ سے سو سوا سو میل آگے تک نکل گیا اور دریائے نائل کے کنارے قیام پذیر ہوا۔

میرا فرار

ایک دن مقامی لوگوں کی طرف سے یہ وحشتناک خبر ملی کہ بلجین سرکار کے سپاہیوں کا ایک گروہ مجھ جیسے غیر اجازتی کالے شکاریوں کو جان سے مارنے کے لئے آرہا ہے میں نے یہ سنتے ہی فوراً کیمپ اٹھایا اور برطانوی حدود کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے رات کے دس بجے دریائے نائل کو عبور کر کے برطانوی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس دوڑ دھوپ میں تھک کر چور ہو گیا تھا کئی گھنٹہ تک بیہوش سا پڑا رہا ساتھی کے بھی حواس کچھ ٹھکانے نہ تھے مگر برطانوی حد پر پہنچنے سے ہمارجان میں جان آگئی ایک اطمینان نصیب ہوا۔ ڈیرہ نصب کر کے چند روز ہم نے آرام کیا ایک دن ایک شخص نے یہ خبر سنائی کہ میرا زخمی کیا ہوا ہاتھی مر گیا اور اس کے دانت گاؤں کے پٹیل نے اپنے پاس رکھ لئے ہیں۔ اتفاق سے ان دنوں ڈاسن نامی ایک یورپین شکاری بھی وہاں شکار کر رہا تھا۔ پٹیل نے ایک دانت اسی کا شکار سمجھ کر اس کے حوالے کر دیا ہے اور ایک پر خود قابض ہے یہ سنتے ہی میں آگ بگولہ ہو گیا اور مجھے ایک پرانا مقولہ یاد آیا۔

انڈے بے وے بی فاختہ کوئے بچے کھا جائیں

عصہ سے میں جلد ہمیاروں سے لیس ہو کر مذکورہ گاؤں میں داخل ہوا یہ گاؤں چاروں طرف بانسوں کے چھ سات فٹ اونچے مضبوط جالیوں سے گھرا ہوا تھا اور آنے جانے کا راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک آدمی مشکل سے پار ہو سکتا تھا غیر میں اس میں داخل ہوا اطراف کی تمام بستیاں اسی طرح بانسوں اور کانٹے دار درختوں سے گھری ہوی تھیں ان احاطوں کے اندر گاؤں کے لوگوں کی گھانس کی جھونپڑیاں تھیں اور ان جھونپڑیوں میں رہنے والے انتہائی محنتی جفاکش اور بہادر تھے۔ میں نے گاؤں میں داخل ہو کر پٹیل سے ملاقات کی اور اپنے مقصد کو اس پر یا کسی اور پر ظاہر ہونے نہ دیا اور چکنی چپڑی اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے پٹیل کو بستی کے باہر لے آیا اور جب میں یہ سمجھا کہ اب میں گاؤں والوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہوں تو آہستہ آہستہ سے دانت کا مطالبہ شروع کیا اور وہ بات کو ٹالنے والے جوابات دینے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ جس طرح گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلا کرتا اسی طرح سیدھے طریقہ سے دانت کا حاصل کرنا بھی مشکل ہے۔

پٹیل پر حملہ تب میں نے یکا یک تیور بدل کر بھری ہوی بندوق کی نال اس کی پیشانی پر رکھتے ہوے کہا کہ ہاتھی دانت فوراً حوالہ کردو ورنہ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں

قطعی دریغ نہ کروں گا۔ اس کافوری اثر ہوا پیٹل نے اپنے ساتھی کو دانت لانے کے لئے کہا جب تک میں نے اس سے دانت وصول نہ کر لیا اس کو وہاں سے ہٹنے نہ دیا۔

یک اور حق دار

دانت لے کر جونہی میں اپنے ڈیرے میں داخل ہوا ڈاسن آیا اور اس پر اپنا حق جتانے لگا بہت ہی رد و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ مرے ہوئے ہاتھی میں سے گولی کس کی نکلی ہے قبل اس کے تحقیق کی جائے ڈاسن بپھر گیا اور اپنے جسمانی طاقت کے بل پر اس نے اس بحث کو ختم کرنا چاہا میں نے یہ دیکھتے ہی اپنا ریوالور اٹھایا اور اس کا رخ اس کی چھاتی کی طرف کر دیا فوراً میری تمام شرائط منظور کر لیں

صلح

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے
جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ڈاسن کے ہمراہ میں نے اپنا آدمی کر دیا اور وہ دونوں اس گاؤں کو گئے جس میں وہ شخص موجود تھا جس کے پاس مرے ہوئے ہاتھی کے جسم میں کی گولی تھی۔ تلاش کے بعد شخص مذکور ملا اسے معہ گولی میرے پاس لایا گیا میں نے بنظر غائر گولی کو دیکھا وہ گولی

میری بندوق کی نہ تھی۔ کیونکہ وہ گولی ۶۰۰ بور کی تھی اور میری بندوق ۵،۷،۷ بور کی تھی تب میں نے بخوشی جان کو جو کھوں میں ڈال کر لایا ہوا ہاتھی دانت ڈاسن کے حوالے کر دیا ڈاسن نے شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں پچھلے واقعات پر پردہ ڈالتے ہوئے آپس میں بغلگیر ہوئے اور اپنی اپنی راہ لی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک ہاتھی پر میں نے گولی چلائی ہاتھی مر گیا مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ نر نہیں بلکہ مادہ ہے تو مجھے انتہائی مایوسی ہوئی کیونکہ برطانوی حدبیں مادہ اور جس کے دانت ۳۰ پونڈ سے کم وزن کے ہوں مارنا قانوناً جرم ہے۔ اس لئے میں نے اس لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہاتھیوں کا گروہ پھر سامنے آتا ہوا دکھائی دیا میں فوراً ہی سنبھل گیا۔

ایک ہاتھی قریب ہی ایک

شکاری خود شکار کے پھندے میں

جھاڑ کے پیچھے دیکھائی دیا جھاڑی اور میرے درمیان ۰ اگز کا بل تھا اس کی آڑ سے اور دس بیس قدم آگے بڑھا ہاتھی بالکل سامنے اور میرے نزدیں آچکا تھا میرا خیال تھا اس کی پیشانی پر ایک گولی چلا کر اس کا خاتمہ کر دوں گا اس لئے میں نے اپنے ایک نالی وزنی بندوق سے نشانہ جا کر گولی چلائی ہاتھی نیچے گرتے ہوئے دکھائی دیا لیکن پھر سنبھلتے

ہوئے بھی نظر آیا اس نے اپنی سونڈ اوپر کر کے ایک خوفناک چیخ
ماری یہ چیخ مجھے ریلوے انجن کی سیٹی کی سی معلوم ہوئی اور وہ
میرے طرف دوڑا لیکن مجھے اس کے حملہ سے کچھ خوف نہ ہوا۔
کیونکہ گولی چلنے کے بعد میرے بندوق بردار شخص مسمی جما نے
دوسری دونالی والی ۵۷۷ بور کی بندوق مجھے دے دی اسی
دفعہ میں ہاتھی چار پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر آپہنچا میں نے بندوق
اٹھاکر اس کے دو گھوڑے چلادئے لیکن بندوق نہ چلی
بندوق کے نہ چلنے سے اوسان خطا ہو گئے میں نے سمجھا کہ بندوق
بگڑ گئی ہے۔ اب اپنی حفاظت کے لئے سوائے بھاگ نکلنے
کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے پاؤں شل ہو گئے۔
اب آگے بڑھنے کی طاقت نہ تھی نہ پیچھے مڑکر دیکھنے کی ہمت،
ایسا معلوم ہوا کہ اب میں گرا چاہتا ہوں بمشکل پیچھے مڑکر دیکھا، ہاتھی
دکھائی نہ دیا۔ میں تو ملک الموت کے پنجے سے صحیح وسلامت نکل
گیا لیکن جما کا کیا حشر ہوا ہاتھی میرے پیچھے نہیں۔ تو اس کے
معنی یہ ہیں کہ اس نے جما کا تعاقب کیا ہوگا ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔
زبان خشک ہو گئی منہ سے بات نہ نکل سکی۔ یونہی تھوڑی
دیر نیم جان حالت میں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ طبیعت سنبھلنے
پر جما کی تلاش میں نکلا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا
پھر آہستہ آہستہ بڑی ہوشیاری سے ڈرتا ڈرتا واپس لوٹا۔

اور زور زور سے جما کا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا بالآخر جما نے جواب دیا جواب سنتے ہی جان میں جان آئی اور اس وقت مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

جما کی آپ بیتی (Jama)

جما پر اس عرصہ میں جو کچھ گذری اس کی بیتی اسی کی زبان سے سنئے "جب میں نے آپ کو دونالی والی بندوق دے کر ایک نالی والی بندوق کو میں نے لیا آپ پر ہاتھی کو حملہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس لئے میں حملہ کے رُخ کو چھوڑ کر قصداً سیدھی جانب بھاگنے لگا۔ اس موقعہ کے لئے میرا ایسا کرنا ہی بہتر تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے زمین پر گر پڑا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھی پاؤں سے پاؤں ملائے کھڑا ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھی نہیں بلکہ موت میرے پاؤں سے اپنا پاؤں ملائے کھڑی ہے، اب یونہی پڑے رہنے کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی تھوڑی دیر بعد ہاتھی خود چند قدم آگے بڑھ کر گر پڑا اور میری جان بچی، گویا ہاتھی کا جما کا تعاقب کرنے سے میری جان بچی اور جما کی جان زمین پر گر پڑنے کی وجہ سے۔

یہ مصیبت کیوں نازل ہوئی

یہ بتلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ آفت ناگہانی ہم پر کس طرح آئی ہو۔ اور کیوں؟ بات صرف اتنی ہے کہ، ہاتھی کو حملہ

کرتے دیکھکر حسب عادت جمانے بندوق سنبھالی کیا چ اوپر اٹھائے بغیر میرے ہاتھ میں دے دی اور میں بدحواسی میں اس کا خیال نہ کر سکا اسی لئے یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی۔

بمباسہ کو واپسی اس مصیبت کے نزول کے چند دن بعد یکایک میں دوبارہ بلیک فیور (BLACK FEVER) میں مبتلا ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ میں ۱۹۰۸ء میں پھر واپس بمباسہ آیا

بمباسہ میں کاروبار بمباسہ میں میرے ایک پرانے رفیق مسٹر کملاشنکر ایک عرصہ سے کاروبار کر رہے تھے۔ اور اچھی طرح کام چل رہا تھا۔ چونکہ میری صحت بیحد گری ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں خود اپنا مستقل کام چلانا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اپنی رقم میں نے ان کے سپرد کر دی جس کی وجہ سے انھیں اپنے دھندے میں بڑی مدد ملی۔ میں دیسائی صاحب کے مکان پر مقیم تھا۔ یوں تو میں ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ ہر روز ان کے آفس جایا کرتا تھا وہ امپورٹ کمیشن ایجنٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے جسے ہر چند سمجھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا، ہنڈی سے کیا مراد ہے۔ مدتی ہنڈی کسے کہتے ہیں۔ بل ڈسکونٹ کیا بلا ہے۔ حتی کہ جمع اور خرچ بھی سمجھ نہ آسکا چند دن یونہی گذرتے رہے صحت یہاں بھی خراب ہی رہی۔

ہندوستان کو واپسی حصول صحت کے لئے بالآخر اپنے پیارے وطن ہندوستان ہی کو واپس آنا بہتر سمجھا اور ہندوستان آنے والے جہاز پر سوار ہو گیا یہ جہاز انتہائی غلیظ تھا اور مسافر بھی بہت زیادہ تھے۔ ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک جانے کے لئے بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا

ہندو دھرم کی تنگ نظری یوں تو جہاز میں بہت سے واقعات پیش آئے لیکن یہاں کا صرف ایک دردناک ذکر کرتا ہوں۔ ہوا یہ کہ اس جہاز میں ایک ہندو بیمار زرگر بیماری کی حالت میں ہندوستان جانے کے قصد سے سوار ہوا تھا قبل اس کے کہ وطن تک پہنچے اس کی موت اس تک پہنچ گئی۔ جہاز میں سفر کرنے والے دوسرے ہندوؤں سے کہا گیا کہ اسے غسل دے کر اپنے مذہبی عقائد کے موافق کپڑا لپیٹ کر سمندر میں ڈالنے کے لئے جہاز رانوں کے حوالے کریں۔ لیکن ان پوتر لوگوں میں سے کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوا کیونکہ وہ زرگر کے فرقہ سے نہ تھے۔ یہ گفت وشنید کوئی پون گھنٹہ تک ہوتی رہی جب مجھے اس دلخراش سانحہ کی اطلاع ہوئی تو انتہائی دکھ ہوا جملہ گجراتیوں کا یہی جواب تھا کہ وہ اس کے فرقہ سے نہیں ہیں، مسلمان بھائی جن کے ساتھ ہم اچھوت اور ملیچھ کا سلوک روا رکھتے ہیں، ہم ہندوؤں کا ہندو میت کے ساتھ غیر ہمدردانہ

سلوک دیکھ کر اچنبا کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم اپنے مذہب کے مطابق اس میت کے آخری مراسم ادا کرنے کے لئے قطعی تیار ہیں۔ کیونکہ ہم ہندو مراسم سے واقف نہیں۔ یہ عالم دیکھ کر مجھے ہندو دھرم کے متعلق بہت صدمہ ہوا اور اُس کے خلاف حقارت کے جذبات پیدا ہوئے اور دل میں کہا خدایا یہ دھرم دنیا کے تختہ سے مٹ جائے تو اچھا ہے کیونکہ یہ انسانیت کے لئے ننگ ہے

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہندوستان کی غلامی کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں اس چھوت چھات کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے اس اونچ اور نیچ نے ہمکو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے جب تک یہ اونچ نیچ ختم نہ ہوگی ہماری غلامی کی زندگی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ انھیں خیالات کو لئے ہوئے میں آگے بڑھا میت کو غسل دے کر اور کفن پہنا کر دفن کرنے کے لئے جہاز رانوں کے حوالے کیا جہاز ران اتفاق سے سب کے سب مسلمان تھے۔ جنھوں نے حسب معمول میت کی آخری تعظیم کے لئے جہاز کے انجن کو بند کر دیا جہاز ٹھہر جانے کے بعد انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ کرین کے ذریعہ میت کو ایک تختہ پر ڈالکر سطح آب پر اتارا گیا۔ جس لاش کو چھونے کے لئے بھارت کے پوتروں کی انگلیاں تک نہ بڑھ

سکیتی تھیں اس انسانی لاش کو انتہائی مقدس سمجھتے ہوئے سمندر
کی پروقار موجیں خوش آمدید کہتی ہوئی آگے بڑھیں اور اپنے وسیع
آغوش کو وسعت قلبی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کی امانت دار
بنا گئیں۔ اس آخری رسم کے بعد جہاز روانہ ہوگیا۔ مجھے اس
رسوائی کی زندگی پر افسوس ہوا اور اس موت پر رشک بھی آیا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہندوستان میں قیام تین ماہ تک میرا قیام ہندوستان میں رہا اخبار کالی کے مدیر پانچے پہلی مرتبہ جیل میں جانے کے بعد ان کی جگہ کام کرنے والے مسٹر پرشوتم پنت کھرے کی رہائی جیل سے ہوئی تھی معافی نامہ داخل کرنے کے باوجود اُن کو چھ ماہ کی سزا دی گئی اور ان کے اس فعل کی وجہ سے سزا بھگتنے کے باوجود بھی ان کو اہل پونہ کی ناراضگی حاصل کرنی پڑی قید سے رہائی کے بعد وہ احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے اتفاقاً ان سے میری ملاقات ہوئی اور انھوں نے مذکورہ بالا واقعات کا اعادہ کیا۔ معافی نامہ داخل کرنے کی وجہ انتہائی اصرار پر بھی انھوں نے نہیں بتلائی صرف اتنا کہا کہ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ مجھے جیل کی تکالیف سے نجات ملے۔ جیل تو خدام وطن کا گھر ہے۔ خیر جو کچھ بھی مقصد ہو۔

افریقہ کو واپسی کچھ دن اور قیام کر کے میں پھر افریقہ جانے لگا تو مسٹر پرشوتم پنت بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ اور کئی سال تک میرے ساتھ افریقہ میں رہے میں وہاں جا کر چندے حصول معاش کے لئے دیسائی کے ساتھ ملکر تجارت کرنے لگا۔

سیاست کے میدان میں سنہ ۱۹۱۲ء میں مجھے ایک موقعہ پر ایک جلسہ عام میں ایک قرارداد کی تائید کے لئے مجبور کیا گیا میں انتہائی مجبوری کے عالم میں بادل نخواستہ کھڑا ہوا تھوڑی سی تقریر کے بعد جسم پر پسینہ آنا شروع ہوا زبان رکنے لگی جوں توں کر کے تقریر کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد مجھے گاہے گاہے احباب کے اصرار سے تقاریر میں حصہ لینا پڑا کچھ مدت بعد جلسوں میں بولنے کی کافی مشق ہو گئی

انڈین ایسوسی ایشن لوگوں نے پکڑ کر مجھے انڈین ایسوسی ایشن کا معتمد بنا دیا یہ سکرٹری شپ مجھے اس لئے نہیں ملی کہ میں کسی ہنر میں یکتا تھا بلکہ یہ نوازش صرف اس وجہ سے ہوئی کہ وہاں کھلے طور پر کوئی کام کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا، تجارت پیشہ حضرات ان امور سے لاعلم اور تعلیم یافتہ طبقہ ملازمت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس میں کام کرتے کرتے مجھے قومی امور سے دلچسپی بڑھنے لگی میں نے مشرقی افریقہ یوگانڈا۔ زنجبار، اور اس وقت کا جرمن مشرقی افریقہ جواب

ٹبانگہ نیکہ ٹیری ٹیری کہلاتا ہے ان سب مقامات کا دورہ کیا اور ان محصول کے تجارت پیشہ حضرات اور لیڈروں سے ملاقات کرکے بمبا سہ میں کانگریس کا اجلاس منعقد کرنے کے لئے ان کی ہمدردی حاصل کی۔ دارالسلام میں ہندوستانیوں کو وہاں کے نیگرو کے مقابلہ میں کوئی زیادہ حقوق نہ تھے البتہ گو اگے ہندوستانیوں کو یورپ کی فوجی حکومت کی عدالت برائے نام تھی کورٹ میں دعویٰ دائر کرنے کی صورت میں مدعی اور مدعی علیہ ہر دو کو وکیل کی ممانعت تھی عہدہ دار جو کچھ حکم دے وہی انصاف تھا عدالت کیا تھی۔ جبر و تعدی کا ایک سرگرم ادارہ تھا۔

میں نے دارالسلام میں تمام ہیو پاریوں کو بلا کر ایک جلسہ منعقد کیا اس وقت کے مشہور ہیو پاری سری پت ناسر ویر جی صاحب جو ایک مشہور اور با اثر شخص تھے جلسہ کے صدر بنائے گئے اور اسی جلسہ میں دارالسلام انڈین اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔

حالات کا جائزہ

حالات کا تحقیقی نظر سے مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا کہ برطانوی مقبوضات میں جو حقوق ہندوستانیوں کو حاصل تھے اسقدر اختیارات بھی جرمن سرکار ہندوستانیوں کو دینے کے لئے آمادہ نہ تھی ان کی اکثر حکومت ہندوستانیوں کے لئے کس قدر تکلیف دہ تھے اور اس میں اصلاح کی کس درجہ اور کہاں کہاں گنجائش ہے؟

ان امور کا احساس وہاں کے باشندوں کو کرانے کیلئے کوئی کامیاب راہ سوائے انڈین ایسوسی ایشن کے نظر نہ آتی تھی اس لئے میں نے اس پر زور دیا اور متحد ہونے کے لئے اپیل کی، اپیل کا کافی اثر ہوا۔ اور ہماری انجمن نے ایک مضبوط اور با اثر ہندوستانی سماج کی حیثیت اختیار کر لی جسے جرمن سرکار نے بھی تسلیم کر لیا۔ یہ انجمن اب تک وہاں قایم ہے اور سرگرم کار ہے۔ کانگریس کے انعقاد کی تاریخ مقرر کی گئی ہیں اور رام بھائی پٹیل اس کے شریک معتمد بنے اس کانگریس کے کام میں اس وقت کے مشہور تاجر سیٹھ طیب علیؒ جیون جی، سیٹھ عبدالرسول علیؒ ونیا وشرام وغیرہ نے دل کھولکر مالی امداد کی۔

ان کی ان ہمدردیوں کی وجہ سے کام کو آگے بڑھانے کا جوش پیدا ہوا دوڑ دھوپ کے سارے کام ... ہم لوگوں نے ..... پایۂ تکمیل کو پہونچائے لیکن تقاریر سے متعلق نظام العمل بنانے کا کام ہم لوگوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ حسن اتفاق سے ان دنوں ایل ڈبلیو رِچ نامی ایک بیرسٹر صاحب جنہوں نے جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے زیر نگرانی بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے اپنے کسی کام سے نیروبی آئے ہوئے تھے ہمیں جیسے ہی اس کی خبر ملی۔ ہم نے تار کے ذریعہ ان کو دعوت دے کر بلا یا یہ بیرسٹر صاحب نوآبادیوں کے ہندی مسائل سے اچھی طرح واقف تھے

سے ایک ہی رات میں انھوں نے جملہ مضامین تیار کر لئے جن کا ہم نے گجراتی میں ترجمہ کر لیا۔ اور مناسب ترمیم و اضافوں سے ان کو ہر حیثیت سے مکمل کر لیا۔ ہماری جماعت الغرض ہر طرح منظم اور باقاعدہ بن گئی۔

میرا ذاتی کاروبار اس وقت میں ایک محدود کمپنی کا ڈائرکٹر اور جنرل منیجر تھا اس کمپنی کا کام بہت زوروں پر تھا اس کی ترقی کا دارومدار تمام تر مجھ ہی پر تھا سیاسیات میں شرکت کی وجہ سے اس کام پر جو اثر پڑا اول اول تو مجھے اسکا احساس نہ ہوا آیندہ عرض کروں گا کہ میرے سیاسی شغف نے میرے کاروبار کو کس درجہ مجروح کیا یہ داستاں دراز بھی ہے اور دلسوز بھی! لیکن میرے سامنے ہر حال میں یہ شعر

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بیجان
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

سو، لیلیٰ سیاست" کے عشق و محبت کے لئے اُس کے مجنوں کو جس جس وادی سے گزرنا ناگزیر ہے۔ میں اُن سے بخوشی گزرا اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے استقلال عطا فرما کر مجھے ننگ محبت ہونے سے بچا لیا۔

ساولے موت کے تختہ پر

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

ماہ جولائی ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ عظیم کا آغاز ہوا ہماری سرحد جرمن افریقہ کی سرحد سے ملحق تھی۔ جنگ کی آگ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی، مارشل لا کا نفاذ ہوا، لیکن میں نے اپنی سیاسی جد و جہد کو اسی طرح جاری رکھا، جنگ شروع ہونے کے چند ماہ بعد حکومت نے ریچ صاحب کو شہر بدر کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہم پر بھی کسی قدر خوف طاری ہوا، تاہم ہماری جہد و جہد بالکل بند نہیں ہوئی اس وقت ریلوے میں ہندوستانیوں ہی کی زیادہ تعداد تھی حکومت نے ان کی تعداد اور تنخواہوں میں کمی کرنا شروع کر دی اس خصوص میں ہم نے اپنے ادارہ کی جانب سے ریلوے منیجر کو احتجاجی خط لکھ کر اپنے

جد و جہد کو جاری رکھا نائرو بی اور ممباسہ میں ریلوے میں ہڑتال شروع ہوئی جس میں ہم نے اہم حصہ لیا یہ معاملہ تھوڑے ہی دنوں میں فیصل ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے ہمارے دشمنوں کی تعداد اور بڑھی ۔ جرمنی کے داؤ پیچ کی وجہ سے برطانوی عہدہ دار بڑے پریشان ہو گئے تھے ۔ ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کی ہمت بیٹھ چکی تھی ۔ چھ سو میل ریلوے لائن کی حفاظت کرنا نہایت ہی مشکل کام تھا ۔ روزانہ رات میں کہیں نہ کہیں دشمن آکر بموں کے ذریعہ لائن کو نقصان پہونچایا کرتے تھے ۔ جس کی وجہ سے برطانوی عہدہ دار اشتعال میں آنے لگے اور دشمن کا غصہ ؛ ا ہندوستانیوں پر اُتا ۔ نیز بعض بد باطن لوگوں کو بھی اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل باہمی عداوت و حسد کے لئے یا خانگی معاملہ میں دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے ضرر رسانی اور ایذا رسانی کا موقع ہاتھ آگیا ۔

ایک شخص کو برطانوی حکومت کے خلاف کسی کے سامنے کچھ کہنے کی پاداش میں فوجی قانون کے تحت سزا دی گئی ۔ ایک سنار کے پاس جب کہ وہ اپنے وطن جارہا تھا ۔ گاندھی کے انڈین ہوم رول کی گجراتی کاپی پائی گئی ۔ سنار نے یہ کتاب اپنے بچہ کو دینے کے لئے ممباسہ کے ایک مطبع سے خریدی تھی ۔ وہ خود بھی پڑھنا بھی نہ جانتا تھا ۔ اس کو وطن جانے سے روکا گیا اور جس مطبع سے یہ کتاب

خریدی گئی تھی، اس کی تلاشی لے کر کل کتابیں ضبط کرلی گئیں اور مالک مطبع سری بالا شنکر جی کو، ممنوعہ لٹریچر رکھنے کے خود ساختہ جرم میں چھ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ سے اکثر لوگ خوف زدہ ہوگئے۔ مہاتما جی کی یہ کتاب بالکل بے ضرر تھی۔ حکومت نے اس کے خلاف جو گرمی دکھائی بجائے اس کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے اُس کے پاس کیا ہے۔

میری گرفتاری

یہ حال دیکھ کر میں نے اپنے مکان میں لکھی ہوئی یا چھپی ہوئی کوئی کتاب تو کیا معمولی کا غذات تک نہ رکھے۔ کیونکہ معلوم نہیں کب اور کس وقت کونسی کتاب اور کونسا اخبار خلاف قانون قرار دیا جائے اور مفت میں ہماری گردن ناپی جائے آخر ایک دن بمباسہ میں فوجی لوگ ایک ہی وقت دس آدمیوں کو گرفتار کر کے جیل لے گئے اور ان کی غیر موجودگی میں انکے مکان کی تلاشی بھی لی گئی۔ گرفتار ہونے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ ان خانہ تلاشیوں میں جو مال و متاع ہاتھ لگا ضبط کیا گیا۔ تمام کاغذات چاہے وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی سب قابل ضبط قرار پائے۔ اور مکان والوں کی طرح میرے مکان والوں کو بھی حکم ہوا کہ بغیر کچھ لئے ہوئے فوراً گھر سے نکل جائیں،

میری بیوی کی ہوشیاری

جب خانہ تلاشی کے لئے سرکاری عمال مرے گھر پر پہونچے۔ میری بیوی للتا چھوٹی لڑکی سرلا کو لے کر باہر نکل گئی باہر نکلتے وقت کچھ زیورات اور رقم اپنے جیب میں چھپا کر لے جانے میں کامیاب ہوگئی ورنہ ان کا تلاشی میں باقی رہنا ایک ناممکن سی بات تھی۔ جن کے مکان میں سے زیورات یا رقمیں برآمد ہوئی انھیں کچھ ہی ماہ قید رہنا پڑا یا شہر بدر کر دیے گئے لیکن جن کے مکان سے ایسی رقمیں حاصل نہ کی جاسکیں۔ انھیں نت نئے مشکلات میں گرفتار رہنا پڑا۔ یہ میرا قیاس ہے اس کی تائید میں مزید معلومات آئندہ پیش کروں گا۔

خانہ تلاشی کے وقت للتا میرے ایک دوست کے گھر چلی گئی۔ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو میں بھی للتا سے جا ملا دس بجے رات تک محفل احباب میں غپ شپ کر کے للتا اور دیگر احباب سے رخصت ہو کر اپنے ایک دوست رام بھائی پٹیل کے ہمراہ پولس اسٹیشن پر گیا۔ رام بھائی کے مکان پر بھی ضبطی کا عمل ہوا تھا۔ بیچارے کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ وہ بیحد شکستہ دل تھے۔ چونکہ ان کے مکان سے کچھ زیورات وغیرہ سرکاری تفتیش کنندوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اس لئے اُن کو سزائے قید بامشقت کے بجائے صرف شہر بدر ہونے کی زحمت دی گئی۔

پولیس انسپکٹر نے فوجی عہدہ دار کو ہم لوگوں کے بارے میں ٹیلیفون کیا اور اس کے احکام کی بنا پر ہم دونوں کو جیل میں ڈال دیا گیا، جیل میں ہم دونوں کو ایک کمبل دیکر الگ الگ دو کمروں میں بند کر کے مقفل کیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آگئی۔

دل کو ہو چین تو نیند آتی ہے اِنگار پر

دوسرے دن تقریباً نو بجے پچیس آدمی کی ایک جماعت محبس میں آئی اور اُس نے قیدیوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں اور پاؤں میں لوہے کی وزنی زنجیریں ڈالکر پیدل اسٹیشن پر لائی ایک تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں سب کو بھر دیا۔ ہم کل نو قیدی تھے۔ آیندہ سلسلہ واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا مختصراً تعارف بھی کرا دوں۔

اسیرانِ بلا کا تعارف

(۱) مسٹر کیشو لعل ...... اہلکار عدالت العالیہ ببماسہ۔ آپ ہندو یونین نامی، مذہبی اور سماجی ادارہ کے معتمد تھے۔

آپ کو اس وقت بیرونی میں ہونے کی وجہ سے منتقل کر کے والی لایا گیا۔

(۲) مسٹر بشن داس شرما ڈسرکٹ مجسٹریٹ کے ذمہ دار اہلکار اور آریہ سماج کے ایک رکن۔

(۳) بابو بنسی لال ریلوے کے ذمہ دار گڈس کلرک اور آریہ سماج کے لیڈر

(۴) دھنی رام ایک پنجابی پہلوان بشن داس کے دوست بالکل ناخواندہ۔

(۵) رام بھائی پٹیل میری کمپنی کے منیجر اور کانگریس کے شریک معتمد۔

ہم سب میں آپ ہی ایک سند یافتہ تھے

(۶) شمبھو شنکر ایک وکیل کے کلرک جنہیں یہ خبر نہیں کہ سیاسی یا سماجی جدوجہد کس چڑیا کا نام ہے

(۷) پریم شنکر ایک یورپین تجارتی کمپنی کے اہلکار کبھی سیاسیات میں آپ نے دخل نہیں دیا۔

(۸) گوکل داس ایک سیدھے سادھے تاجر ذات کے لوہار مسٹر شمبھو شنکر اور پریم شنکر کی طرح آپ بھی سیاسیات یا سماجی کاموں سے بالکل الگ تھلگ رہنے والے۔

(۹) ایک خاکسار خانہ بدوش دردمند ہندوستانی جس سے ہمارے قارئین غالباً ناآشنا نہیں۔

مجھے یا رام بھائی پٹیل کو صرف گرفتار کیا جاتا تو خیال کیا جاسکتا تھا کہ ایک سیاسی ادارہ کے خدمتگزار ہیں۔ لیکن یہ سب باقی اور ناکردہ گناہ لوگوں کو آخر کیوں مبتلائے مصائب کیا گیا

کیا بے گناہی بھی کوئی مستقل جرم ہے۔ ؟ جو ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل رہے ہیں۔

جملہ حالات پر مدبرانہ نگاہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پردے کے پیچھے خود غرض اور کمینہ ہاتھ کارفرما ہے

مجرم ہاتھ — ہماری گرفتاری سے تقریباً ایک ماہ قبل صنیف نامی پنجابی شخص گاؤں گاؤں اور گھر گھر پھرتا تھا۔ یہ شخص پہلے پولیس میں تھا۔ اس نے میرو بی میں یورپین حدود کے اندر ایک زمین اقرار کے ذریعہ لی تھی۔ اس کا نیرو بی میں مسٹر گوکل داس کے خاندان والوں سے بھی تعلق تھا فوجی محکمہ میں اس غدار شخص کو کرایہ پر جاسوسی کے لئے لیا گیا تھا۔ میری دانست میں یہ مجرم ہاتھ بھی ناکردہ گناہوں کو گرفتار کرانے میں شریک تھا۔

ساولے والے جیل میں ہم گاڑی میں تو سوار تھے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ہمیں یہ نہ معلوم تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ نصف شب گذرنے کے بعد ہم ایک اسٹیشن پر اتارے گئے بمشکل معلوم ہو سکا کہ یہ وائے ہے۔ یہاں سے پیدوسٹ مارشل کے دفتر میں ہمیں پہونچایا گیا جس کے طرف فوجی کیمپ تھا اور اسی میں خاردار تاروں کے وسیع

احاطہ کے وسطی حصہ میں ایک ٹین کی شیڈ کھڑی کی گئی تھی، بیچ میں دفتر اور دفتر کے اطراف جیل کے کمرے۔ شیڈ کے کھلے حصہ میں ہمیں رہنے کے لئے جگہ دی گئی۔ سردی اس بلا کی تھی کہ دانت سے دانت بجتے تھے لیکن ہمیں اوڑھنے کے لئے صرف ایک سوتی چادر دی گئی اور بستر کے لئے صرف زمین جس پر مٹی کا قدرتی فرش تھا۔ دوسرے دن بطور بستر واک کی ڈوری کی گٹھری دی گئی اس عرصہ میں ہمارا جسم انتہائی گندہ ہو گیا۔ کپڑے غلیظ ہو گئے اور ان میں جوئیں اور پسو بھر گئے لیکن ہمیں غسل کرنے کا موقعہ دیا گیا اور نہ بدلنے کے لئے دوسرے کپڑے دئے گئے۔

ہم نو آدمیوں میں سے مجھے اور مسٹر کیشو لال کو ایک کمرہ میں اور منسی لال و گوکل داس کو دوسرے کمرے میں بند کیا گیا۔

ہمارے پہرہ دار ہم پر پہرہ دینے والے انگلینڈ کی لیبر پارٹی کے کچھ رضا کار رکھے گئے تھے، پیشہ ور سپاہی نہ تھے، ان میں حجام، دھوبی، سنار، لوہار، پھیری والے کوئلہ کی کان کے مزدور تھے۔ ان میں ایک بھی تعلیم یافتہ شخص نہ تھا مگر پھر بھی رات ہوتے ہی یہ سب لوگ میرے پہلو کے کمرے میں جمع ہونے اور روزمرہ کے واقعات، مذہبی، سیاسی اور سماجی امور پر نقد و تبصرہ اور مذاکرہ کرتے ان کی گفتگو سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ انگلینڈ کا بے علم طبقہ بھی ہمارے ہندوستان کے

گریجو میٹوں سے کہیں اونچے معلومات رکھتا ہے۔

اسیران نو کچھ دن بعد ان پہرہ داروں کو بدل دیا گیا۔ دوسرے پہرہ دار آگئے ایک دن ۲۵ افراد جو وہاں کے مقامی باشندے تھے گرفتار کر کے لایا گیا اور اسی محبس میں ان کے لئے بھی گنجایش نکالی گئی۔ ہر ایک کے کمرہ میں ایک ایک دو دو آدمی ٹھونسے گئے اور کچھ کھلے میدان میں رکھے گئے۔ ان میں سے ایک کو میرے کمرہ میں اور ایک کو کشو لال کے اور ایک کو منی لال کے کمرہ میں بند کیا گیا۔ ان کی زبان ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔

ان غریبوں کو تو بالکل اس کا علم بھی نہ تھا کہ وہ کس جرم میں یہاں لائے گئے اور کس گناہ کی پاداش میں یہ سزا جھیل رہے ہیں۔

ورانڈے کے قیدیوں کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے جکڑ کر چھت سے باندھ دئے تھے۔ رفع حاجت کے لئے جاتا ہو تو سپاہی صرف پاؤں کی رسی کھولدیتے تھے۔ اور ان کے ہاتھ کی رسی اپنے ہاتھ میں لے کر جانوروں کی طرح پھکاتے ہوئے لیجاتے تھے۔

ایک قیدی کی جرأت ایک رات تقریباً آٹھ بجے گوکل داس کے کمرہ میں رہنے والے نیگرو نے اطراف میں لگے ہوئے خاردار تاروں کو پھیلا کے باہر کود پڑا، سنتری کے بندوق کی آواز نکلنے سے قبل وہ بھاگ نکلا،

اس کے جسم کے گوشت کے ٹکڑے تاروں کو لگے ہوئے تھے۔ اس کی اس جسارت سے ہمیں بڑی حیرت اور بڑی خوشی ہوئی لیکن افسوس اس خوشنودی کے اظہار کا موقعہ نہ مل سکا۔

ردعمل اس واقعہ کے بعد جملہ ہندوستانی قیدیوں کو بھی رات کو سوتے وقت ہتکڑیاں پہنکر سونے کا حکم ہوا جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔

کچھ اور ایران بلا چند روز بعد کچھ اور قیدی لائے گئے، جو وضع و قطع سے پنجابی معلوم ہوتے تھے۔ یہ لوگ ریلوے انجن کے لئے لکڑی کاٹا کرتے تھے ان میں رامانند بودھ راج بھی تھے۔ یہ رامانند بودھ راج اینڈ کمپنی کے نام سے یوگانڈہ ریلوے کے مختلف اسٹیشنوں پر لکڑی مہیا کرتے تھے، انکے ملازمین گنیش لال ویوگراج ایک ڈپو پر کام انجام دیتے تھے، اور دوسرے ڈپو پر بشن سنگھ اور لعل چند نامی ایک سولہ سال کا لڑکا دونوں ملکر کام کیا کرتے تھے۔ بودھ راج کی عمر ۶۰ سال، اور رامانند کی ۵۰ سال تھی۔ یہ دونوں بہت مالدار بیوپاری تھے اسی اثنا میں ستیارام نامی ایک اسٹیشن ماسٹر کو گرفتار کرکے لایا گیا یہاں اس امر کی وضاحت ضروری نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اس کی خوش قسمتی سے گرفتار کرنے والے لوگ ملٹری پولیس کے نہیں تھے بلکہ ملٹری اسٹاف کے کارکنان نے اُسے گرفتار کیا تھا۔ گرفتار

کے بعد ان کے مکان کی تلاشی لی گئی اور اس میں کوئی ایسی چیز نہ نکل سکی جو قانوناً قابل اعتراض ہو۔ فوراً اس نوعیت کی رپورٹ پیش کی گئی۔ لیکن پولیس کا گرفتاری میں یہ ظاہر کرنے کا ارادہ تھا کہ بمباسہ میں گرفتار شدہ اشخاص کا تعلق اس شخص کے ساتھ تھا۔ لیکن گرفتاری ملٹری اسٹاف کے ذریعہ عمل میں آئی تھی۔ اس لئے پولیس کو اپنے ارادے میں ناکامی ہوئی اس کا آئندہ آنے والے واقعات سے بخوبی انکشاف ہوگا۔

ملزموں کا حشر

ایک خوفناک نظارہ

ایک دن ہم تمام ملزموں کو ہتھکڑیوں کے ساتھ باہر نکالا گیا۔ اس دن خلاف معمول سولجروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تقریباً دو میل چلکر ہم رائفل رینج میں داخل ہوئے۔ سب کو نصف دائرہ کی شکل میں کھڑا کیا گیا۔ درمیان میں ایک ستون گڑا ہوا تھا۔ نیگرو ن میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر لایا گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اسی ستون سے باندھ دیئے گئے آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اس کے سینہ پر ایک گول کاغذ چپکا دیا گیا۔ اور تقریباً دس فٹ کے فاصلہ پر (۶) سپاہی کھڑے کئے گئے جنھوں نے فائر کا حکم پاتے ہی ایک ساتھ گولیاں چلا دیں پھر

پھر سارجنٹ کے لوڈ یعنی بندوق میں کارتوس بھرنے کا حکم دیا تیسری مرتبہ بھی اس سفاکانہ فعل کا اعادہ ہوا تینوں مرتبہ گولیاں مقتول کے سینے کو پار کرتی ہوئی چلی گئیں۔ ایک کے بجائے اٹھارہ گولیوں کو چلانے کا مقصد جوش انتقام اور دہشت انگیزی کے علاوہ شاید یہ ہو کہ یہ شہید کہیں زندہ نہ ہو جائے۔

کہیں سو نہ جائیں کروٹ یہ مجاہد بدلے۔ ہیں ابھی خوف سے لرزہ براندام حسود

اس خوفناک بیرحمانہ مظاہرے نے ہمارے دل میں فوجیوں کے خلاف زبردست نفرت کی لہر دوڑادی۔ اور کچھ لوگ جنھوں نے آرام و آسائش کی زندگی بسر کی تھی وہ بہت خائف ہو گئے۔ یہ دردناک واقعہ ۱۰ اگست ۱۹۱۵ء کو پیش آیا۔

سوالات اور سازشیں

ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۵ء یہ دو مہینے امن سے گزرے یعنی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا نومبر میں لمباسہ پولیس کے چند عہدہ داروں نے ہم میں سے چند آدمیوں کو الگ الگ کرکے الگ الگ سوالات کرنے شروع کر دیا۔ مختلف ملزموں سے دریافت کرنے کے بعد ایک دن کیشولال صاحب کو بلا کر لے گئے اور ان کو ایسا نوٹ بک دکھایا گیا جس میں کچھ میرے متعلق لکھا گیا تھا۔

یہ نوٹ بک کیشولال صاحب ہی کے مکان میں تلاشی

کے موقعہ پر اُن کے گھر کے سامان میں ملا تھا۔ یہ سامان محمد یوسف کی بیوہ کا تھا جو کیشو لال کے یہاں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہتی تھی۔

پولس کی کوشش اس سے پولس کی یہ کوشش تھی کہ کیشو لال اپنا یہ بیان دین کہ یہ نوٹ بک محمد یوسف (جس کا چند ماہ قبل انتقال ہوا ہے) کا ہے جس کی رُو سے مجھے تختہ دار پر لٹکانے کی ایک وجہ پیدا ہو جائے اس شہادت کے عوض کیشو لال صاحب کو رہا کر دیا جائے لیکن پولس کو اپنا یہ ارادہ صاف صاف ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نوٹ بک سے مرا کیا تعلق تھا اس کا کیشو لال کو بھی علم نہ ہو سکا۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں حالات میں پھر تبدیلی ہوئی۔ گنیش لال اور یوگراج کو کورٹ مارشل کرنا قرار پایا۔ یوگراج میرے ہی کمرے میں رہا کرتا تھا اور گنیش لال میرے پہلو کے کمرے میں گنیش لال کو انگریزی آتی تھی۔ یہ دونو صاحب جس گاؤں میں لکڑی کٹواتے تھے وہیں ایک یورپین صاحب یہی پیشہ کرتے تھے ان میں آپس میں ہم پیشے کی بنا پر رقابت رہتی تھی۔ کچھ دنوں سے یہ گورے صاحب رضا کار فوجی عہدہ دار اس عہدہ کی وجہ سے رامانند بدھ راج اینڈ کمپنی سے ان کو انتقام لینے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا۔ چونکہ دشمن کے حملہ ہمیشہ ریلوے راستوں پر ہوا

کرتے تھے ۔ دشمنوں کو اشیائے خوردنی فراہم کرنے کا الزام ان لوگوں پر عاید کیا گیا اور واقعہ یہ تھا یوگراج اور گنیش لعل یہ ہمیشہ ریلوے لائن ہی پر رہا کرتے تھے مگر اس لائن کی پوری نگرانی ہماری مرہٹہ پلٹن کیا کرتی تھی۔ یوگراج باورچی کا کام بھی بہترین جانتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ان سپاہیوں کے کھانا پکانے کا انتظام کر دیتے تھے۔ کیا ستم تھا کہ وہ خدمت سرکاری سپاہیوں کی کریں۔ امداد اپنی فوج کی کرتے تھے۔ اور الزام دشمن کی اعانت کا عاید کا کیا جائے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا اور جنوں کا خرد
جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

کورٹ مارشل کا فیصلہ

وہی قاتل وہی منصف، وہی شاہد ٹھہرے

صبح کے ۹ بجے پروسٹ مارشل کیجھر آل آفس میں آئے اور آتے ہی ہمیں جگایا اور گنیش لال اور یوگراج کو اپنے کمرہ میں بلوایا بشن داس شرما کو بھی انگریزی کا ہندی میں ترجمہ کرانے کے لئے طلب کیا گیا۔ کمرہ میں داخل ہونے پر فیصلہ سنایا گیا۔ کورٹ مارشل نے

نے گنیش لال اور یوگراج کو گولی مارنے کا حکم دیا ہے جس کی فوری تعمیل کے انتظامات ہو رہے ہیں۔

گنیش لال اور یوگراج نے اس فیصلہ کو انتہائی خندہ پیشانی سے سنا دن بھر مجھے تشویش رہی لیکن گنیش لال اور یوگراج بالکل مطمئن تھے ان کے چہرے سے استقلال اور بہادری نظر آ رہی تھی، اسلئے الٹے وہ ہمیں کو دلاسا اور تسلی دے رہے تھے۔

یوگراج نے ایک آٹے کا چراغ تیار کیا۔ اور اسے نمکا کر کے آنے والی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور گنیش لال نے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر ایک غزل بعنوان جلاد کی تلوار گائی جس کی آواز آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے صبح سات بجے ہماری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور ہم کو موقعہ دیا گیا کہ ان بہادروں سے ملاقات کریں۔

واہ رے شوق شہادت کوئے قاتل کی طرف
قص کرتا گنگناتا جھومتا جاتا ہوں میں

اس کے بعد ان لوگوں کو مقتل کی طرف لیجایا گیا۔ یوگراج اور گنیش لال مقتل کی طرف چل نہیں رہے تھے بلکہ دوڑ رہے تھے ان کی رفتار کے سبب سپاہیوں کو بھی اپنی رفتار تیز کرنی پڑی مقتل میں پہونچکر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حکم دیا گیا لیکن انھوں نے اپنی جوان مردی کی توہین سمجھتے ہوئے اس سے صاف

انکار کر دیا اور یہی ان کے لئے موزوں تھا۔لوڈا اور فیروز کے آرڈر کے ساتھ ہی بہادروں کی زبان سے انکار کی آخری صدا بلند ہوئی جو فضا میں پھیلی اور اُن کی پاکیزہ اور معصوم روح کے ساتھ ملکر بہشت بریں کو پرواز کر گئی۔ دوبارہ سہ بارہ گولیاں چلائی گئیں۔ ے۔

وہی قاتل، وہی شاہد وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کرے خون کا دعویٰ کس پر

کیمپ پر واپس آنے کے بعد ہم پر کیا بیتی اس کا اندازہ ناظرین خود اپنے حساس قلب سے کر سکتے ہیں۔

۲۸ر نومبر ۱۹۱۵ء پر دو لسٹ مارشل نے مجھے اور کیشو لال کو بلایا تھا۔یکم اگست ۱۹۱۵ء کی دوپہر کو ہم لوگ دائی لائے گئے تھے۔ ۶ر اگست کو کیشو لال نے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لئے حسب ذیل درخواست لکھی اور پرو ولسٹ کو دی کہ بذریعہ تار روانہ کر دے مگر اس نے صاف انکار کیا۔

تار بنام گورنر

تار :- بشرف ملاحظہ عالیجناب گورنر صاحب نائرو بی۔
مثنیٰ :- بخدمت جناب چیف جسٹس صاحب ممباسہ

متعدد سربرآوردہ لوگوں کو فوجی آفسروں نے گرفتار

کر کے پانچ دن سے مقفل کر رکھا ہے جن کی رہائش و آسائش کا کوئی بندوبست اب تک نہیں کیا گیا۔ منڈی میں عدالت سیول سے تحقیقات کرائی جائے۔ "گیشو لعل"

ہماری حالت ان واقعات سے ہم بہت ہی خائف ہو گئے تھے، ہمارے دلوں پر اداسی چھا گئی تھی۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمیں بھی گنیش لال اور یوگراج کی طرح ایک نہ ایک دن جام شہادت پینا پڑے گا۔

اس اثنا میں لبشن سنگھ اور لعل چند کے ساتھ بھی کورٹ مارشل نے وہی سلوک کیا جس کے تصور ہی سے آدھی جان نکل جاتی ہے۔

ہم کو سزائے موت شام کے وقت پروولسٹ مارشل نے مجھے اور کیشو لال کو طلب کر کے فیصلہ سنایا کہ ایک ہفتہ بعد ہم پر بھی کورٹ مارشل کیا جائے گا۔

کیشو لال نے ہمت کر کے وجہ دریافت کی، الزام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے ثبوت کے بعد ۲۰ سال قید اور ایکہزار روپیہ جرمانہ یا سزائے قتل ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس فیصلہ کے سنتے ہی ہمارے جسم میں خون نہ رہا کیشو لال کو تو غش آگیا۔ زمین پر گرنے ہی والے تھے کہ میں نے بڑھ کر تھام لیا ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ڈاکٹر بلایا گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کے رہین منت ہوں خود ہی ہوش میں آ گئے اور رہیں اپنے مقام پر بھیج دیا گیا۔

تختہ دار

پھانسی کی سزا۔ بودھراج تقریباً ۶۰ سال کا ضعیف العمر شخص تھا سے پندرہ تازیانہ کی سزا دے کر رہا کر دیا گیا۔ کشن سنگھ ولال چند کو بھی اسی ہفتے کورٹ مارشل کیا گیا۔

ان پر دشمن سے ملکر یوگانڈا ریلوے لائن اکھاڑنے میں مدد کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ۵۰۰ میل لمبی یوگانڈا ریلوے لائن دشمن کی سرحد سے بالکل ملحق تھی اتنی لمبی لائن پر دشمن کے دو چار آدمی رات میں کسی ایک مقام پر آ کر ایک ایک فٹ کے گڑھے کھودتے اور ان میں بم رکھ کر لائن آسانی سے اڑا دیا کرتے تھے معلوم نہیں دشمن کو اس کام کے لئے کشن سنگھ وغیرہ جیسے آدمیوں کی کیا ضرورت تھی۔؟ اسے فرنگی ارباب فراست ہی سمجھ سکتے ہیں یوگانڈا ریلوے کو بگڑی کی سربراہی کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی روزی کمانے والے غریب و مجبور کو ان امور سے کیا سروکار؟ خیر عدالت میں ان کے خلاف جو شہادت پیش ہوئی صرف

اس قدر تھی کہ ایک دن ریلوے لائن پر بم پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ بشن سنگھ کے مزدوروں نے بم پھٹنے کے مقام پر جانے کی اجازت چاہی لیکن بشن سنگھ نے اجازت نہیں دی۔ بشن سنگھ نے عدالت کے سامنے اس کا اقرار کیا اس کے ساتھ ہی تازہ جاری کردہ فوجی گشتی چٹھی پیش کی گئی جس میں یہ درج تھا کہ جو کوئی آدمی شام کے چار بجے سے دوسرے دن کی صبح تک ریلوے لائن پر نظر آئیگا اس کو گولی ماردی جائے گی۔ وہاں کے پروولسٹ مارشل نے راما نند سے کہا کہ بشن سنگھ نے اپنی تائید میں جو شہادت اور صفائی پیش کی ہے وہ بالکل واضح صاف اور غیر مبہم ہے اس سے ثبوت ملتا ہے کہ اس نے دشمن کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ فوجی حکم کی تعمیل کی ہے۔

۳ر دسمبر کو بشن سنگھ، راما نند، ولایچند پر چلایا گیا اور ۵ر دسمبر کو مجھ پر اور کیشو لال پر مقدمہ چلایا گیا۔ ہماری طرف سے صفائی کے لئے بنر وجی کے مشہور و قابل بیرسٹر مسٹر کرکیول آئے تھے۔

جاسوس کا پتہ

قارئین کو معلوم ہوگا کہ اس مضمون کے ابتداء میں میں نے محمد یوسف کا تذکرہ کیا تھا آئیے اس ذات شریف کی مزید نقاب کشائی کریں تقریباً دس سال کے بعد محمد یوسف ۱۹۱۴ء میں مجھ سے پھر بمبلاسہ میں آکر ملا۔ ۱۹۰۴ء کے بعد اس کی بیوی نے اس سے خلع حاصل کر کے کسی دوسر

مسلمان سے شادی کرلی تھی۔ پھر نہ جانے کس طرح دوبارہ اسی محمد یوسف کے دامِ زوجیت میں پھنس گئی۔ اس وقت اس کے آنے کا مقصد مجھ سے مدد طلب کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اُسے اپنے دفتر میں کوئی ملازمت دے دوں گا۔

میرا دفتر میرا دفتر اگرچہ کہ کاروباری تھا مگر پھر بھی چونکہ میرا تعلق انڈین ایسوسی ایشن اور کانگریس سے تھا۔ اس لئے یہاں بھی کچھ نہ کچھ سیاسی گفتگو چھڑ ہی جاتی تھی۔

فوجی لوگ رخصت اور فرصت کے اوقات میں آیا کرتے اور دفتر میں بیٹھا کرتے تھے اکثر لوگ گفتگو ہندوستانی اور گورے سپاہیوں کے باہمی تعلقات اور امتیاز پر ہوا کرتی تھی، مثلاً یہ کہ کالے اور گورے کا یہ فرق کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ کالوں کو گوروں کی طرح انسان کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ محمد یوسف جن کا ہمیں تعارف منظور ہے۔ سر پہ پٹی باندھے ہوئے آیا۔ دریافت پر کہنے لگا کہ کسی بدمعاش نے اندھیرے میں رات کو لاٹھی سے مارا ہے اُس کی نحیف و پر درد آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ زخم کاری ہے۔ میں نے اظہار ہمدردی کے لئے اُسے کہا کہ جب تک زخم مندمل نہ ہو جائے آرام کرو، مگر وہ چلا گیا چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ محمد یوسف اسی زخم کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسا۔ اور اس کی بیوی کا سررشتہ کروڑ گیری

میں ہندوستانی مستورات کی جھڑتی کے کام پر تقرر کیا گیا ہے۔
اور بمباسہ میں کیشو لال نے اپنے مکان کا ایک خالی کمرہ اس
کے پچھلے واقعات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُس کو رہائش
کے لئے دیا ہے۔ کیشو لال کے مکان کی جب تلاشی لی گئی۔ تو عورت
کے کمرہ کی بھی تلاشی لی گئی۔ اس تلاشی میں ایک نوٹ بک جس
میں میرے اور بعض دیگر کارکنوں کے متعلق کچھ نوٹ لکھے ہوئے
دستیاب ہوئی خاکسار کے متعلق تحریر تھا کہ میں آج ساوکے کے
دفتر کو گیا تھا۔ وہاں سارے سرکاری سپاہیوں کو ورغلاتے
ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کے
ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کیا جاتا نیز یہ بھی کہہ رہے تھے۔
کہ اگر ترکستان جرمنوں کو مل جائے تو ہندی مسلمان ترکستان
کے خلاف لڑنے پر آمادہ نہ ہوں گے وغیرہ اس سے ظاہر ہے کہ محمد
یوسف نے اپنے ذاتی اغراض یعنی سرکاری ملازمت کے حصول کے
لئے میرے خلاف جاسوسی کا کام انجام دیا تاکہ انگریزوں کو اُس
سے ہمدردی ہو جائے۔

اس نوٹ بک کو میرے خلاف عدالت میں پیش کیا گیا
تھا۔ لیکن اس وقت محمد یوسف خود اپنے کرتوت کی سزا پانے
کے لئے جہنم رسید ہو چکا تھا۔ اور ملٹری اسٹاف بطور شاہد عدالت
میں اُسے پیش کرنے سے قاصر تھی۔ قابل ادخال شہادت نہیں

قرار ہونے دیا۔ اور عدالت کو مجبوراً تسلیم ہی کرنا پڑا۔ ورنہ میرے قتل کئے جانے لئے مزید مواد کی ذرا بھی ضرورت نہ رہی تھی۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کورٹ مارشل کی تحقیقات دو گھنٹے میں ختم ہوگئی۔ شام کے پانچ بجے مجھے اور کیشو لال پرپھر وولسٹ مارشل کے کمرہ میں بلایا گیا یہاں پر ولائے کے کمانڈر جنرل میلسن خود موجود تھے۔ انہوں نے کورٹ مارشل کا فیصلہ پڑھ کر سنایا۔

فیصلہ تم پر سرکار کے خلاف جدوجہد کرنے کا الزام ثابت ہوا اور کیشو لال پر قابل اعتراض کتب رکھنے کا الزام ثابت ہے۔ اور اس الزام میں تم دونوں کے لئے سزائے قتل تجویز کی جاتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ترغیب و ترہیب سے کام لیتے ہوئے یہ غدرانہ تجویز ہمارے سامنے پیش کی سیتا رام نام کا ملزم جو تم میں بہت ہی بدمعاش اور شیطان سیرت ہے اس پر جرم ثابت کرنے کے لئے ہمیں ثبوت کی ضرورت ہے۔ اگر تم لوگوں نے اس کے خلاف شہادت دی تو نہ صرف تمہیں جان بخشی دی جائے گی۔ بلکہ تمہاری آزادی تم کو واپس دی جائے گی۔ کورٹ مارشل کے فیصلہ پر فوراً عمل ہونا ہے لیکن میں تمہیں ۲۴ گھنٹوں کی مزید مہلت دیتا ہوں خوب سوچ لو ورنہ موت کے لئے تیار رہو جاؤ۔ مجھے

بیساختہ ہنسی آگئی اور جب کبھی یہ فیصلہ یاد آجاتا ہے تو اب بھی مسکراہٹ میرے لبوں پر کھیل جاتی ہے۔ ستیارام اور ہم میں ارتباط پیدا کرنے کے متعلق جو کارروائی عمل میں آئی ہے وہ ذرا تفصیل طلب ہے عرض کرتا ہوں ذرا سنئے۔

بمبا سہ میں ہمارے ساتھ گرفتار ہونے والے جملہ اشخاص کی خانہ تلاشی کے سلسلے میں تمام کاغذات ضبط کر لئے گئے لیکن ان میں ہمارے خلاف کوئی مواد حاصل نہ ہوا۔ اس لئے ہم جملہ اشخاص کا نام دینے والے شخص کو کچھ نہ کچھ مواد فراہم کرنا ضروری تھا۔ اس خانہ تلاشی کے چار ہفتہ بعد ضبط کردہ کاغذات میں ایک ٹائپ شدہ کاغذ جس کے نیچے ستیارام لکھا ہوا تھا ملا۔ اس قسم کی شہادت پولس کی جانب سے پیش ہوئی۔ وائے جیل میں آنے سے قبل ہم نے ستیارام کو خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پراسیکیوشن کی جانب سے جو شہادت پیش ہوئی تھی اس میں بیان کیا گیا کہ یہ خط فلسکیپ سائز پر ٹائپ کیا گیا تھا۔

جب وہ ملا تو معلوم ہوا کہ اس خط کو لفافے میں رکھنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے فوراً نہیں رکھا جا سکا۔ اس خط کا مضمون یہ بتلایا گیا۔

ستیارام فوج میں برطانوی سرکار کے خلاف بغاوت پھیلانا

ہے۔ اس خط میں "ہم بھولا نا تھ" لفظ لکھا ہوا پایا گیا۔ سیتارام نے یہ مجھ سے ظاہر کیا تھا کہ جاسوسی کے سلسلے میں یہ لفظ حنیف کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط تیار کر کے ہمارے سامان میں چھپا کر رکھہ دینے کا کام اسی بدمعاش حنیف نے کیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ حنیف نامی ایک بدمعاش ہے جسے سررشتہ فوج نے شہر بدر کر دیا ہے مذکورہ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر میلین ہمکو سیتا رام کے خلاف شہادت دینے کے لئے کیوں مجبور کر رہے تھے۔ سیتارام کو ملٹری اسٹاف کے عہدہ دار نے گرفتار کر کے اسی وقت اُس کے مکان کی تلاشی بھی لے لی تھی اور رپورٹ میں لکھدیا تھا کہ کوئی لائق اعتراض چیز نہیں پائی گئی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ سیتارام کے خلاف کوئی نیا مواد فراہم کیا جائے جس سے اوس کو اچھی طرح سنا یا جاسکے

ہمارا حال

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان ۲۴ گھنٹوں میں ہمارا کیا حال ہوا کیا بتاؤں جس شخص کو ہم نے دیکھا بھی نہیں اس کو بلاقصور موت کے منہ میں دیکر خود بچ جانا انسانیت کے خلاف تھا۔ اس لئے یقین ہوگیا کہ اب پھانسی قریب ہے اس کے بعد خیال آیا کہ جب جان جانی ہے تو ان کے ہاتھ کیوں جائے اور خودکشی کر کے خود کیوں نہ ختم ہو جاؤں خودکشی کے لئے جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے اتفاق

سے موجود تھا لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح مرنے کے بعد لوگ مجھے بزدل کہیں گے۔ ظلم ظالم کے ہاتھوں ہی ظاہر ہو تو بہتر ہے ہمکو سزا سنانے کے بعد لاجپند کو پھانسی کی سزا سنائی گئی رامانند کو رہا کیا گیا۔ بشن سنگھ کو بلایا ہی نہ گیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے دفتر میں جہاں تین فوجی عہدہ دار اور بیچ میں پرووسٹ مارشل بیٹھا ہوا تھا وہاں لے گئے اور وہاں ہم سے پھر دریافت کیا گیا کہ کیا سیتا رام کے خلاف بیان دینا ہے ہم نے کہا کورٹ میں بیان دے چکے ہیں ہماری جانب سے اس میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

موت ملتوی آرڈر سنایا گیا ہمیں پھانسی دینے کے لئے بیاسہ بھیجا جائے۔ آج کی موت کل پر ٹل گئی۔ اس مبارک موقعہ پر میں نے باورچی سے آخری دعوت کے لئے کہا جو منظور کر لی گئی۔ شیرے پوری۔ اور بھاجی تیار کی گئی خوب اطمینان سے ہم نے کھانا کھایا نو بجے شب کو پرووسٹ مارشل کے ایک یوروپین سارجنٹ کے ایک اہلکار نے ہم چاروں کو ایک ہندی پلٹن کے حوالدار کے حوالے کیا اور کہا کہ یہ ہندوستانی شریف لوگ ہیں ان کو ہتکڑی وغیرہ نہ پہنائی جائے لیکن یہ سفارش کارگر نہ ہوئی۔ اور ہم اسی شان سے لائے گئے۔

ہم پر تقریبًا دو ماہ یوروپین سپاہیوں کا اور دوسرے

دو ماہ ماہ ہندی سپاہیوں کا پہرا تھا۔ یورپین سپاہی آزاد ماحول میں پلا ہوا ہونے کی وجہ سے ہم سے ہمدردی سے پیش آتا لیکن یہ برادران یوسف" ہمارے لئے بیحد تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ ہمیں پھانسی کی سزا کا حکم ہوتے ہی یہ ہندوستانی سپاہی پیشاب پخانے کے لئے بھی ہتکڑیاں ڈالکر لے جاتے تھے۔ اس سختی کا حکم اُن کو مکام بالا سے نہیں ملا تھا۔ مگر نشۂ غلامی کی حدت اس درجے کو پہونچی ہوی تھی اوسی کا یہ اثر تھا۔

بیچارہ لالچند کمسن ہونے کی وجہ سے گھبرایا ہوا تھا۔ بشن سنگھ کا خیال تھا کہ اسے شہر بدر کیا جائیگا۔ ہمکو اب کسی بات کا غم یا فکر نہ تھی، بالکل مطمئن، ہشاش بشاش تھے۔ ٹرین میں ہم لوگوں نے ہنکرا ورگا کر وقت کاٹا۔ دوسرے دن صبح کو تقریباً دس بجے بمبا سہ اسٹیشن پر پہونچے ہمارے استقبال کے لئے کمانڈنگ آفسر بذاتہٖ تشریف لائے ہوئے تھے ہمارا جلوس پیدل ہی ہتکڑیوں سمیت نکالا گیا گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ گاؤں کے وسط میں پھانسی کا ستون گاڑنے کا کام شروع ہو گیا۔

جیل میں جیل پہنچنے کے بعد ہم چاروں کی ہتکڑیاں نکالکر جیل کے صحن میں کھڑا کیا گیا۔ بشن سنگھ کو ایک طرف لے گئے۔ کمانڈنگ آفسر نے کہا ہم تینوں کو پھانسی کی سزا ہوئی ہے اور اس کا مرافع ممکن نہیں ہم نے استدعا کی کہ پھانسی ہمکو

بخوشی قبول ہے لیکن ہمکو قتل گاہ تک پہنچنے کے لئے اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دی جائے۔ خوش قسمتی سے اس کی اجازت مل گئی۔ پھانسی سے قبل رکھے جانے والے کمروں میں ہم تینوں کو بند کرکے مقفل کیا گیا۔ میرے اور کیشولال کے کمرہ کی کھڑکی میں سلاخیں تھیں جن میں سے باہر جیل کی صحن کا نظارہ کرتے رہے۔ اوگا کپڑے بدلے بھوک بہت محسوس ہو رہی ہے چپاتی اور دال دی گئی جسے کھایا پھر بھی بھوک کم نہ ہوی ہم نے اور چپاتیاں طلب کیں باورچی نے کہا چپاتی اور دال سب حساب سے پکی ہیں اس سے زیادتی کی گنجائش نہیں میں نے کہا جیلر سے کہہ کر اور گیہوں دلوادوں گا۔ بھوکے رہکر پھانسی پر جانے کے مقابلے شکم سیر ہوکر جان دینا بہر حال بہتر ہے۔ بیل اور بکری کو بھی ذبح کیا جاتا ہے تو ذبح سے پہلے کھلایا پلایا جاتا ہے۔ ہم تو انسان ہیں۔ یہ سنکر اس نے ہم کو اور کھانا دیا اور ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔

مطالعہ کتب جیل میں وقت نہ کٹنے کی وجہ سے کچھ کتابیں مطالعہ کے لئے طلب کیں۔ بائبل اور گیتا بھی گئیں۔ یہ قصہ پڑھ کر کہ حضرت مسیح کو بھی سزائے قتل بھگتنی پڑی۔ مجھے اپنے آیندہ واقع ہونے والے قصہ قتل کی یاد آگئی۔ گیتا میں یہ دوبارہ پڑھا کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے اس فقرہ نے میرے دل کی جرارت میں اضافہ کیا۔

ایک دن اسی طرح گزر گیا" باہر کیا ہو رہا ہے ہمیں کچھ نہیں معلوم باورچی نے کھانا دینے کے بعد کہا کہ آج بشن سنگھ کو شہر کے بیچ کھلے طور پر پھانسی دی گئی۔ اور ہم کو بھی یکے بعد دیگرے دی جائے گی۔ بشن سنگھ کا یہ انجام سنکر بہت رنج ہوا لیکن اس حادثے کی خبر نے میرے دل کو مطلق کمزور نہیں کیا۔

دو دن گذر گئے تب میں نے جیلر کو بلا کر کہا کہ انگریزی قانون کی رو سے واجب القتل مجرم کو پھانسی دینے میں بلا وجہ تاخیر کرنا اور اُسے روحی و قلبی تشویش و اضطراب کے سپرد رکھنا ممنوع ہے۔ مجھے موت کے انتظار کے لئے کیوں وقف کر دیا گیا ہے۔ میرے لئے اس انتظار کی تکلیف موت کی تکلیف سے بمدارج زیادہ ہے

اے مرگ ناگہاں تیری غیرت کو کیا ہوا
کیوں انتظار تیغ ستم کر رہا ہوں میں

پھانسی کے لئے اس قدر مضطرب دیکھ کر میرے خیال میں اسے یہ محسوس ہوا کہ ہمیں دی ہوئی سزا انسانیت کے خلاف ہے اس نے انتہائی ادب سے کہا کہ میں سیول حکومت کا جیلر ہوں تمہارے متعلق کوئی حکم میرے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو فوجی حکام کو ابھی مطلع کئے دیتا ہوں۔ چوتھا دن نکلا تو خوشی میں کٹا کھانا تو جیل کا تھا لیکن بھلا لگتا تھا۔ جو کچھ ملتا تھا کھاتا اور زیادہ بھی طلب کرتا تھا۔ چوتھے دن صبح کمانڈر آفسر کی آمد

کی اطلاع دی گئی۔ میں سمجھا پھانسی کا حکم لائے ہوں گے اس لئے
اطمینان سے کپڑے بدلنے لگا آئینہ دیکھکر مانگ نکالی پھر ایک
آدمی آکر کہنے لگا صاحب انتظار فرما رہے ہیں میں نے کہا لباس
پہن رہا ہوں صاحب کو بہت جلدی ہے تو انھیں خود آنے کے لئے
کہدو۔ جب میں لباس باطمینان پہن چکا تو صاحب کے روبرو
اپنے مستقبل کو سننے کے لئے آکھڑا ہوگیا۔ کہ اُن کی زبان میرے لئے
کیا فیصلہ سناتی ہے۔

رہائی

ہندوستان کو واپسی

بست سالہ مرگ مسلسل

میری رہائی بھی، عجیب حیران آفریں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت کی کار فرمائی مسلم ہے دفتری حکومت کے کل پرزوں نے گو میری شمع حیات کو گل کر دینا چاہا۔ مگر قضا و قدر کا فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہی ہوا اور ظاہر ہے کہ مادی حکومتیں، حکومت ربانی کے مقابلہ میں کر ہی کیا سکتی ہیں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ واقعہ یہ ہوا کہ کمانڈنگ آفسر کے سامنے ہم سب کی طلبی ہوئی۔ میں کیشو لال اور لال چند ایک قطار میں اُس کے سامنے کھڑے کئے گئے اس وقت ہم سب اس کی جنبش لب کے تماشائی تھے۔ کہ اس کی زبان سے

کیا نکلتا ہے اتنے میں اُس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا ایک خاص انداز سے اُس نے ہم لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر کاغذ کو پڑھ کر سنایا۔ جس میں تحریر تھا۔

"حسب الحکم جنرل کمانڈنگ آفیسر مسٹر ساوے
اور کمپٹو لال کی سزائے قتل منسوخ کی جاتی ہے
اس کے بجائے، بیس سال کی سزائے بامشقت
دی جاتی ہے"

جب یہ کلمات میرے کانوں میں پڑے تو گویا ایسا معلوم ہوا کہ سوختہ کی شدت سے میرا تمام جسم ایک قد آدم شعلے کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے۔ سزائے قتل منسوخ...... بیس سال کی قید بامشقت...... گویا ایک مرگ مسلسل...... ایک موت متواتر...... اس نام و نہاد مقید و مجبور زندگی سے، قتل ہو جانا کہیں خوشگوار تھا۔ بیس سال تک گھٹ گھٹ کر مرتے رہنا.... اور پھر نہ مر سکنا الامان کس درجہ المناک اور صبر آزما ہے۔ میرے دل و دماغ میں مختلف خیالات کے شورش افزا طوفان بپا ہوگئے۔ میرے حواس پر برق سی کوند گئی۔ میں نے اس عالم طیش میں آکر کمانڈنگ افیسر سے کہا۔ کہ :- "مجھے یہ سنکر کہ قتل کی سزا بیس سال میں تبدیل ہوگئی مطلق کوئی خوش نہیں ہوئی۔ اور نہ میں آپ کے اس فیصلہ کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ اس پر شکریہ ادا کروں...... میں یہ کہہ

رہا تھا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کہا :۔

جناب یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں تو اوپر کے آئے ہوئے حکم کو صرف سنا دینے کا فرض ادا کر رہا ہوں۔

جیل کی زندگی

جیلر کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے اپنا لباس اُتار کر جیل کا لباس پہن لیا۔ اس طرح ہم لوگ گشتی دگردن زدنی مجرموں کی حیثیت سے دفعتہً بیت سالہ قیدیوں میں آ گئے۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مسٹر شرما کو بھی وائے سے یہاں لے آیا گیا۔ ملتانی رام اُس کا جانی دوست، اور رازدار رفیق تھا، مگر حکومت کے دباؤ کاریوں نے اُسے اپنے دوست کے خلاف (سرکاری گواہ کی حیثیت سے) شہادت دینے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ملتانی رام نے برسرِ عدالت گواہی دی کہ مسٹر شرما حکومت کے باغی ہیں اور انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت انگیز تقریریں کی ہیں۔

ملتانی رام اپنے دوست کو پھنسا کر سرکاری مہربانی سے رہا ہو گیا۔ کیونکہ اس حکومت میں ساری رعایتیں ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جو اپنے ملک و خاندان ملک کے ساتھ انتہائی نامہربانی سے پیش آتے ہیں۔

چند شہیدانِ ستم ؟

ہمارے قیام والے کے زمانے میں چند اور مظلوم تھے جن کو حکومت کے مذاق ستمگری نے اپنی دلچسپیوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان میں سے زنجبار کے ایک مشہور خوجہ تاجر علی دینا دھالا بھی تھے، جن کو گناہِ بے گناہی، کی پاداش میں نہایت بے دردی کے ساتھ پھانسی دی گئی تھی۔

ایک عرب دولتمند بانا بکاری اور اُن کے بھائی کو جو بیحد شریف، اور امن پسند طبیعت رکھتے تھے، بہاسہ جیل میں... لایا گیا تھا۔ تاکہ اپنی دس سال کی طویل مدت قید کو یہاں سے کاٹیں اسی عرب کے دوسرے بھائی کو حکومت کی تیغ جفا نے ہمیشہ کے لئے بارِ حیات سے سبکدوش کر دیا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ان دفتری حکومت کے گورے کارپردازوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ مرکزی حکومت کے اعضاء وارکین پر یہ واضح کردیں کہ بغاوت کے جراثیم اس طرح پھیل گئے ہیں کہ اب اُن پر قابو نہیں حاصل کیا جاسکتا اور ہم اُن کے طوفان بغاوت کو دبانے کے لئے ہر نوع کی زیادتی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام زیادتی یہ تمام ظلم وتعدی بے سود ہی ثابت ہوئی کیونکہ یوگنڈہ ریلوے کی تباہی وبربادی میں دشمن کے حوصلے روز افزوں بڑھتے ہی گئے۔ اور اُس کے حملے برابر تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ بالآخر ہندوستانی

فوجی عہدہ داروں کے ہاتھوں سے مشرقی افریقہ کی جنگ کی کمان لے لی گئی۔ اور یہ خدمت جنوبی افریقہ کے محکمۂ فوج کے سپرد کی گئی۔ جنوبی افریقہ کے ذمہ دار فوجی افسروں نے حکمت عملی میں نمایاں تبدیلی کر دی۔ یعنی ہندوستانیوں اور عربوں کو خواہ مخواہ گرفتار کرنے۔ سزا دینے اور پھانسی دینے کا شغل یک لخت ترک کر دیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد وائے کے گرفتار شدہ تمام قیدیوں کو ہندوستان روانہ کر دیا ان میں ستیارام بھی تھے۔

آریہ سماج کے لیڈر بابو منی لال اور مسٹر پٹیل اور دیگر اشخاص کا سامان بحق حکومت ضبط کر لیا گیا تھا اس سامان میں علاوہ دیگر اشیاء کے نقد رقم اور نقروی و طلائی زیور بھی تھے۔ کیشو لعل زیورات کو زمین میں دفن کر چکے تھے اس لئے سرکاری عمال کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اب رہ گیا میں۔ میرے پاس تھا ہی کیا؟

ہندوستان کے پردہ کوروں کے مظالم

ہندوستانی سپاہیوں پر

ہندوستان کے آب و دانے سے پلے ہوئے اور ہندوستان ہی کی نعمتوں سے متمتع ہوکر اور حیات دینے والے گوروں نے نوع بنوع ظلم کئے۔ بلکہ ان کی شقاوت نے اُن غریب سپاہیوں کو بھی نشانہ جور بنانے میں ذرا بھی کمی نہیں کی جو مجبور سپاہی تھے اور جن کا سب سے بڑا جرم اگر کچھ ہو سکتا تھا تو طرف یہی کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ ان پر ظلم کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بہانہ چاہئے تو کسی پر یہ الزام لگایا کہ یہ لڑائی میں بزدل ہے کسی پر یہ کہ اس نے اپنے آپ کو خود زخمی کر لیا ہے۔ کسی پر کہ اس نے اپنے کمانڈر

کے خلاف فلاں بات کہی۔ رنگ رنگ کے الزامات، طرح طرح کی تہمتیں لگانے میں ان کو خوف خدا تو کیا ہوتا۔ انسانیت کی شرم بھی مس نہ کرتی "ان خود عاید کردہ" بے اصل الزامات کی پاداش میں کسی کو دس برس کسی کو ۱۴ برس کسی کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ ان بے گناہ قصور داروں سے بمبا سہ جیل بھر دیا گیا اور بعض کو قید و بند کے مصائب جھیلنے کے لئے ہندوستان بھیج دیا گیا

بانا بکاری عرب قیدی کی رہائی اور اسکے بھائی کی موت

جس عرب نے بانا بکاری وغیرہ کے خلاف سرکاری گواہ کی حیثیت سے شہادت دی تھی اُس نے نئی فوج کے ذمہ دار حکام کے سامنے جاکر یہ اقرار کیا کہ میری جس شہادت کی بنا پر بانکا بکاری وغیرہ کو سزا دی گئی۔ وہ شہادت قطعی جھوٹی اور بے اصل ہے مجھ سے یہ شہادت بہ جبر و اکراہ دلائی گئی۔ حکام نے یہ سُنکر اُس کو گرفتار کر لیا مگر بانکا بکاری کو رہا کر دیا۔ مگر اس قسم کی جھوٹی شہادتوں کی بنا پر جن دوسرے ناکردہ گناہ گاروں کو گرفتار کر کے زندان کے ہولناک مصائب کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ اُن کی کچھ بھی تلافی نہیں کی گئی۔ بانکا بکاری کی رہائی سے کچھ زمانہ قبل اوس کا بھائی جو بہت ہی کمزور و نحیف تھا اور جیل کی شدتیں زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا تھا۔ بیمار ہو کر قید زندگی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا،

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مسٹر بھیسے کے کرتوت ہماری گرفتاری کے بعد ہندوستانی تجارت پیشہ اشخاص سرکاری مظالم سے ہراساں و ترساں ہوگئے اور ہر لحظہ انتہائی خوف و دہشت کے ساتھ منتظر رہنے لگے کہ اب ہم پر کیا بلا نازل کی جاتی ہے۔ اور کالی مخلوق پر کیا آفت ڈھائی جاتی ہے۔ اُن کے اس خوف سے فوج کے خفیہ ڈپارٹمنٹ نے فائدہ اٹھایا۔ خاص کر مسٹر بھیسے نے تو وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ان صاحب نے ہموطنی، اور وطن پرستی کا خوب ہی حق ادا کیا۔ یہ فرماتے تھے کہ میں مہاراشٹر کا رہنے والا ہوں خالص ہندوستانی ہوں۔ مگر ہندوستان کی محبت واحترام کا یہ حال تھا کہ وہ ہر ہندوستانی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیا کرتے کہ تمہارا نام بھی ملٹری میں دے دونگا تمہارا شمار سرکار کے خلاف باغیوں میں کرا کر سخت سے سخت سزا دلاؤں گا۔ تمہارا حشر بھی وہی کراؤں گا جو اس وقت ساولے اور کیشو لعل کا ہوا ہے اس سلسلے میں وہ ان بیچاروں سے خوب رقمیں بھی وصول کر لیتے تھے

مسٹر بھیسے عجیب و غریب شخص تھے۔ یہ حضرت اپنے کو ہندوستانی بلکہ خالص مہاراشٹری ظاہر کرتے تھے۔ مگر درحقیقت وہ مہاراشٹری نہیں تھے۔ یہ کچھ زمانہ قبل جب میں جیل سے باہر تھا میرے پاس بھی اکثر تشریف لایا کرتے۔ راجپوتانہ کا رزیڈنٹ ان پر مہربان

تھا۔ اس نے ان کو ایک سفارشی رقعہ لکھکر دے دیا تھا۔ یہ اوس رقعہ کی کرامت تھی کہ آپ ملٹری میں کار خاص کے خدمات انجام دیئے کے لئے انتخاب میں آگئے۔ ہم پر مصیبت کے جو یہ پہاڑ ٹوٹے پڑے ہیں۔ اس میں ان کا بھی بہت کافی حصہ تھا۔ جس کا علم ہم کو بہت بعد کو ہوا۔

چاہ کن را چاہ در پیش جو کنواں دوسرے کو گرانے کے لئے کھودتا ہے بالآخر وہ خود ہی اُس میں گرتا ہے یہی حال مسٹر بھینسے کا ہوا۔ ان کا مذاق ستم رانی اور شوق ایذا دہی اس درجہ ترقی پذیر ہوگیا کہ خواص تو خواص عوام ان کی حرکتوں سے تنگ آگئے۔ اور آخر کار سب نے متفقہ طور پر سیول عہدہ داروں کی خدمت میں ان کے خلاف احتجاج کیا۔ ان پر رشوت ستانی کا جرم بھی عاید کیا گیا۔ ماتحد ہونے پر چالان کیا گیا۔ اور مجسٹریٹ نے ایک سال قید بامشقت کی سزا دی۔ گو ہندوستانی فوجی عہدہ داروں نے ان کے بچاؤ کے لاکھ لاکھ جتن کئے مگر سب بیکار ثابت ہوئے۔

ہاں۔ مجسٹریٹ نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی لکھا کہ یہ بہت خطرناک شخص ہے۔ اسے ایک سال سزائے بامشقت بھگتنے کے بعد شہر بدر کر دیا جائے۔

مسٹر بھینسے نے جن لوگوں پر جھوٹے مقدمات چلا کر اور غلط الزامات لگا کر جیل میں بھجوایا تھا۔ اب وہ خود بھی اوسی

لوگوں کے ساتھ قید و بند کے مصائب جھیلتے دکھائی دینے لگا۔

غور فرمائیے کہ بھیسے کے دل پر اس ماحول میں کیا گذر رہی ہوگی کس قدر روحانی تکلیف کس درجہ ندامت و انفعال۔ معاذ اللہ!

فریضۂ انسانیت مسٹر بھیسے کے قید خانے میں آنے کے کچھ دنوں بعد وبائے ہیضہ پھیل گئی اور اس وباء سے نہ جانے کتنے انسان ضائع ہو گئے۔ مجھے جیل ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے کمپونڈر اور وارڈن بنادیا گیا تھا۔ میں مریضوں کو دوائیں دیا کرتا اور ان کی ہر طرح طبی خدمت انجام دیتا دواؤں کا سارا اسٹاک ہر وقت میرے ہی قبضہ میں رہتا تھا۔ میں اگر خبیث النفس ہوتا تو اُس وقت مسٹر بھیسے سے میں اچھی طرح انتقام لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ہیضہ میں بری طرح مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اُن کی دوا وغیرہ سب میرے ہی ہاتھ میں تھی میں جو چاہتا اُن کو پلا کر اُن کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ مگر میرے ضمیر میں اس قسم کا کوئی ناپاک تصور تک نہیں آیا بلکہ اس کے برخلاف میں نے اُن کو بہتر سے بہتر نایاب سے نایاب تر دوائیں دیں جس سے خدا نے اُن کو دوبارہ زندگی بخشی۔ گو اس وقت مریضوں کی کثرت کی وجہ سے اچھی اور موثر دوائیں بہت ہی کم اسٹاک میں رہنے پاتی تھی۔ بلکہ اکثر اوقات تو دوا ملتی تک نہ تھی۔ مگر میں نے اُس کے لئے علاج کی مشکل سے مشکل تدابیر کو بھی بخوشی اختیار کیا کہ انسان

انسان سے انتقام لے کر اپنی فطرت کو بلند نہیں کر سکتا۔

حاجی وارڈ بوائے

اسی زمانے میں ایک سومالی قیدی سے بھی ملاقات ہوئی اس کا نام حاجی تھا اور اس جیل کے دواخانے میں وارڈ بوائے بنا دیا گیا تھا۔ یہ شخص یوں تو دیکھنے میں بہت ہی سیدھا سادھا نیک آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اور سومالی لوگوں کی طرح بہت ہی اشتعال پذیر اور جلد غصہ میں آجانے والا تھا۔ اس نے کسی دوسرے سومالی پر خنجر سے حملہ کیا تھا جس کا پاداش میں اس کو ۱۵ ماہ کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ اس زمانہ اسیری میں وہ مجھے بعض حیثیتوں سے بڑا ہی دلچسپ محسوس ہوا۔ میری اس کی دوستی ہوگئی جب فرصت ملتی تو وہ اپنی زندگی کے حالات سنایا کرتا اور میری پہیلی سنا کرتا۔ ایک روز اس نے دریافت کیا کہ تم محمد یوسف ہندوستانی سے واقف ہو جو بمباسہ میں علی و نیاشرام میں ملازم بھی رہا ہے میں نے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں واقف ہوں اور اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے ایک لمبی چوڑی داستان سنائی جس کا ماحصل یہ تھا کہ میں نے اسے قتل کر کے جہنم واصل کیا تھا یعنی میری ہی خنجر نے اُسے اپنے شرمناک گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے عالم آخرت کو روانہ کیا ہے۔

محفل میلادِ نبوی میں بے ادبی کی سزا

اس کے بعد اُس نے اس کا واقعہ قتل اس طرح بیان کیا :۔

ایک شب ہمارے یہاں - ہمارے پیغمبر صاحب کی میلاد مبارک کی محفل تھی - سب مسلمان جمع تھے - اور اس پاک بزم میں ادب و احترام کے ساتھ بیٹھے ہوئے درود شریف پڑھ رہے تھے اتنے میں ملعون و مردود - اس طرح آیا کہ شراب سے بدمست ہو رہا تھا - زبان سے اول فول بک رہا تھا - صرف اسقدر نہ بلکہ جہاں لوگ بیٹھے ہوئے تھے - اوس سے قریب ہی پیشاب بھی کیا اور اسے ذرا بھی حیا نہ آئی - شرکا محفل کو یہ بیہودگی سخت ناگوار گزری اور انہوں نے اُسے بھلا برا کہا - مگر بجائے اس کے کہ اسے کچھ شرم آتی اس نے اور زیادہ فحش گوئی شروع کر دی محفل میں بے حد بدمزگی پیدا ہوئی - اور یہ گالیاں بکتا ہوا روانہ ہوا اور میں بھی اس محفل مبارک میں شریک تھا - میں نے لاکھ چاہا مگر میں ضبط نہ کر سکا - مجھ پر اشتعال نے پوری طرح قابو پا لیا - اور اُس عالم میں میں اُس کے پیچھے دوڑا - ایک تاریک اور خاموش کوچے میں میں نے اُسے پکڑا اور اپنا خنجر نکال کر میں نے اُس پر ایک حملہ کیا - میرا ارادہ اُسے قتل کرنے کا تو نہ تھا صرف مقصد یہ تھا کہ وہ زخمی ہو جائے - اور جب اس مدہوشی سے نجات ملے تو وہ یہ سمجھے کہ ایسی مقدس

محفل میں بیہودگی کی یہ سزا ہے۔ لیکن میرا حملہ اندازہ سے کچھ زیادہ کاری ہوگیا۔ وہ فوراً زمین پر گر گیا۔ میں اس کے بعد نہایت آہستگی کے ساتھ لوٹا اور خاموشی کے ساتھ پھر محفل میں بیٹھ گیا اور ذکر میلاد سننے لگا۔ یہ گنہگار اس حملہ سے جان بر نہ ہو سکا اور بالآخر سات آٹھ روز تک ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فی النار والسقر ہوگیا۔ پولیس نے محمد یوسف کے قاتل کی بہت تلاش کی۔ مگر اُسے پتہ نہ چلا۔ اور بالآخر پولیس بھی تھک کر خاموش ہوگئی۔

یہ محمد یوسف وہی ہے۔ جس نے مجھے اس حد تک اذیت پہونچائی تھی۔ کہ میں پھانسی کے تختے پر لٹکتے لٹکتے بچ گیا تھا۔ حاجی کی زبانی میں نے یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا کہ قدرت بھی کتنی منتقم ہے حاجی نے محمد یوسف کو قتل کیا۔ گر مذہب واخلاق کے نام پر یہ سزا بہت ہی سخت تھی اگر وہ اپنے مذہب کے علماء سے دریافت کرتا تو غالباً وہ بھی یہی کہتے کہ حاجی کی سزا دہی زیادتی سے خالی نہیں۔ مگر قضا و قدر ایسے ظالم اور دوسروں کی جان و آبرو کے بلا سبب دشمن کے لئے یہی فیصلہ کر چکی تھی بالآخر اس نے اس فیصلہ کے اجراء کے لئے حاجی کو آلہ بنایا۔

ادھر حاجی بھی ایک دوسرے سوامی پر خنجر سے حملہ کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوا اور جیل کے مصائب برداشت کرنے پر مجبور ٹھیرایا گیا۔ غرض قدرت کے نظام کو سمجھنا۔ انسانی عقل کی قوت

سے بہت ہی دور ہے اور پھر اس سے عجیب تر یہ واقعہ ہے۔ کہ حاجی جب جیل سے رہا ہو کر آزاد ہو گیا۔ تو کچھ روز کے بعد اس کی برادری ہی کے دو ایک شخصوں سے اس کی نزاع ہو گئی ایک دن موقعہ پا کر ان دونوں نے حاجی کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں شخص حاجی کو قتل کر کے کچھ آگے بڑھے ہی تھے۔ کہ ان کو کچھ اور لوگ ملے۔ ان لوگوں اور حاجی کے قاتلوں میں تکرار ... واقع ہوئی اور نوبت یہاں تک پہونچی۔ کہ ان لوگوں نے ان قاتلوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ ان قاتلوں کے قاتلوں کا انجام رہائی ہوا کیونکہ انہوں نے اس امر کی قابل وثوق شہادت پیش کر دی تھی کہ ہم لوگوں نے اپنی جانیں بچانے کے لئے مجبوراً ان پر حملہ کیا اتفاقاً یہ لوگ مر گئے۔ اگر ہم ان پر حملہ نہ کرتے تو یقین تھا کہ یہ لوگ ہم کو قتل کر ڈالتے۔ عدالت نے ان کے بیان و شہادت کو اہمیت دی اور سچا سمجھ کر ان کو رہا کر دیا۔

یہ واقعات ایک مآل اندیش اور حقیقت نگر انسان کے لئے بہت عبرت آموز ہیں۔ آدمی ان واقعات سے بہت کچھ موعظت اور سبق حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کے وقائع و حوادث میں دنیا والوں کے لئے طرح طرح کی ہدایات ہیں۔ مگر اللہ رے غفلت کہ انسان کو پھر بھی ہوش نہیں آتا۔

راماننڈ کا انجام میں ابھی جیل ہی میں تھا یہ خبر ملی کہ ظالم راماننڈ بھی قدرتی انتقام کا اس طرح ہدف بنا۔ کہ وہ ایک روز گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ بے تحاشا گرا اور بیحد کرب و اضطراب کے عالم میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ خدا کے یہاں کچھ دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ یہ وہی ستمگر ہے جس نے بے گناہ گنیش لعل کو بلاوجہ مبتلائے مصیبت کیا تھا۔

ہندوستانی فوج کا کارنامۂ شجاعت

ہندوستانی فوج جو شمالی افریقہ میں جرمنی کے مقابلے کے لئے بلائی گئی تھی۔ اس کا تھوڑا سا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ فوج جنرل اکنس کی سرکردگی میں تھی۔ جو پانچ چھ ہزار تجربہ کار مشاق۔ اور بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ محکمہ اطلاعات جنگ نے اطلاع دی کہ ٹانگہ (ایک مشہور بندرگاہ) پر اس وقت جرمنی کی فوج بالکل نہیں ہے میدان بالکل خالی ہے۔ ایسی صورت میں برٹش فوج نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر سکتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ اطلاع غلط نہ تھی۔ اسی بنا پر ٹانگہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے یہ ہندوستانی جمعیت روانہ ہوئی۔ جرمن گورنر

نے جب ہندوستانی فوج کے آنے کی خبر سنی تو اپنے پاس سامان دفاع نہ پاکر لفٹننٹ وان لیٹو (جرمن فوجی افسر) کو حکم دیا کہ اب یہاں مقاومت دشوار ہے اس لئے پیچھے ہٹ جاؤ لفٹننٹ موصوف۔ بہت ہی موقعہ شناس ذہن اور دلیر شخص تھا۔ اُس نے اپنے گورنر کا حکم نہیں مانا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ یہ ہندوستانی فوج وہ ہے جسے ان کی مرضی کے خلاف، انگریزی حکومت اپنے مفاد کی خاطر لڑا رہی ہے اور چونکہ ان کو پیٹ کی مار دے دے کر اور ہر طرح مجبور کر کے ہمارے مقابلے کے لئے لایا گیا ہے اس لئے ان میں سچی بہادری کا جوہر نہیں ہو سکتا۔

جرمن لفٹننٹ نے ادھر اُدھر سے تھوڑی سی جمعیت فراہم کی جو کسی طرح چند سو سے زیادہ نہ تھے، اور بالآخر اس ہندوستانی کثیر التعداد فوج پر نہایت بے جگری سے ٹوٹ پڑا۔

۱۶۰ (سولہ سو) ہندوستانی فوجیوں کو بری طرح مجروح کیا اور نہ جانے کتنوں کو عدم کی راہ روانہ کیا۔ انگریز کمانڈنگ آفیسر یہ سمجھا کہ جرمنی کی فوج بہت زیادہ ہے اور جو اطلاع دیگئی تھی وہ غلط ہے اس خیال نے اوس کی ہمت چھین لی۔ اور اس یقین نے مضبوطی حاصل کر لی کہ اب ہم ذرا اور ٹھیرے تو بقیہ فوج کی بھی جان نہیں بچ سکتی۔ اسی خوف کے ساتھ وہ پوری فوج لے کر بے تحاشہ پیچھے کی طرف بھاگا۔ اور بقیہ فوج کو کسی نہ کسی طرح جہاز میں سوار

کہکے بمباسہ میں لا اتارا اور یہاں پہونچکر غائب شدہ ہوش وحواس درست ہوے۔

شمالی افریقہ میں جرمن فتوحات

اس واقعہ نے جسقدر ہندوستانی فوج کے عزم وقوت کو کمزور کردیا اُسی قدر جرمنوں کے حوصلے بڑہتے گئے۔ اور برابر ایک سال تک جرمن اس علاقے میں فاتح ومظفر ہوتے گئے۔ اور اُن کا زور روز افزوں ہوتا گیا۔ اس سے انگریزی جنگی پالیسی پر بہت برا اثر پڑا۔ جنرل اٹکنس کو تعزیراً واپس بلا یا گیا۔ اور ہندوستانی سپاہیوں اور بڑے عہدے داروں کو ذلت کے ساتھ نکالدیا گیا۔

قید میں میرا ایک دلچسپ مشغلہ؟

جیل میں میری نگاہوں سے عجیب عجیب واقعات گذرتے تھے۔ طرح طرح کے قیدیوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ ہاں مجرم اور جرم ناکردہ غرض دونوں قسم کے لوگ دیکھنے میں آتے تھے۔ اون میں سے کتنے ہی واجب الرحم تھے۔ جنہوں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا۔ اور گردش قسمت سے اس آزمائش میں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ گو میں بھی ایک قیدی ہی تھا اور دوسرے

مجبور اسیروں میں اور مجھ میں کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ تاہم میرا دل انسانیت کی اس مجروحیت پر بہت دکھتا تھا۔ میں برابر اس فکر میں رہتا کہ جو مستحق سزا نہیں ہے انہیں سزا سے نجات ملنی چاہئے۔ اور واقعی مجرم کو اوس کے کیفر کردار تک پہونچنا عین قرین معدلت ہے۔

میں اس خیال کے تحت اس عالم مجبوری میں جو کچھ بھی کر سکتا تھا اُس سے غفلت نہیں برتتا تھا۔ اکثر میری کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور کتنے ہی قیدی ایسے بھی تھے۔ جو بے قصور تھے۔ اور میری حقیر کوششیں اون کی سزا معاف کرانے میں کامراں ثابت ہوئیں۔ میری مساعی کی یہ کامیابیاں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہیں۔ اس سے قبل وہاں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

جیل کے عہدہ داروں کی زیادتیاں اور اُن کے خاموش مظالم کا مقابلہ کرنا بھی میرے لئے بعض وقت ناگزیر ہو جاتا تھا اس میں کبھی ان کے مذاق کو اور کبھی میرے ضبط کو فتح حاصل ہوتی رہتی تھی۔

کچھی مسلمانوں کا مقدمہ قتل

اسی زمانۂ قید میں ایک مرتبہ ایک کچھی کے قتل کے الزام میں نو کچھی گرفتار کر کے لائے گئے۔ یہ لوگ بھڑاتے قوم کے تھے اور ان کا پیشہ جہاز رانی تھا عرصہ دراز سے ان لوگوں کا قیام بمبئی میں

تھا۔ یہ لوگ سخت جاہل اور انتہا درجہ کے لڑاکو ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک شب بمباسہ کے بازار میں یہ لوگ آپس میں حسب معمول لڑ پڑے ان میں سے ایک نے دوسرے کو خنجر بھونکدیا اور وہ فوراً مر گیا۔

مقتول کی پارٹی نے پولیس کی رپورٹ میں اُس ایک شخص کے ساتھ جو واقعی مجرم تھا آٹھ اور بے گناہوں کے نام بھی نوٹ کرائے۔ پولیس نے نو آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ یہ مقدمہ عدالت میں کئی ماہ چلتا رہا۔ ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ بھائیو سنو۔ واقعہ قتل سے کسی عنوان انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ قتل ہوا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تمہیں نو آدمیوں میں سے کسی ایک نے اُسے قتل کیا ہے۔ ایک شخص کی وجہ سے سب نو کے نو کیوں مبتلائے آفت ہوں بہتر ہے کہ جس کسی ایک نے قتل کیا ہے وہ عدالت میں صاف صاف اقرار کرے ایسی صورت میں صرف ایک ہی شخص مستوجب سزا ٹھیریگا۔ باقی اور آٹھ بے گناہ اشخاص کی جان تو بچ جائے گی۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک کی وجہ سے نو انسان تباہ و برباد ہوں" لیکن میرے مشورہ پر کس نے عمل نہیں کیا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ کہ حکومت ایک قتل کے سلسلے میں نو آدمیوں کو تختہ دار پر نہیں لٹکائیگی۔ کچھ دنوں کی سزائے قید ہو جائے گی۔ اور آخر میں سب کے سب زندہ و

و سلامت بچ جائیں گے مگر ان کا یہ خیال بالکل نقش بر آب ثابت ہوا۔ اور عدالت نے اپنے فیصلہ میں ان میں سے پانچ آدمیوں کو پھانسی کی سزا دی۔ اور چار کو رہا کر دیا۔ یہ لوگ پریوی کونسل تک لڑے مگر عدالت تحت ہی کا فیصلہ بحال رہا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص کی وجہ سے بلا وجہ اتنے انسانوں کی جان گئی۔

پھانسی کا عبرتناک نظارہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مجرم کو پھانسی دینا ہوتا ہے تو ۲۴ گھنٹے قبل اوسکو مطلع کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت تم کو بحکم سرکار پھانسی دی جائے گی۔ چنانچہ اس قاعدے کے مطابق ان پانچوں اشخاص کو بھی اطلاع دی گئی۔ یہاں علم النفس کی روشنی میں یہ واقعیت مشاہدہ میں آئی کہ ان میں جو شخص واقعی مجرم اور حقیقی قاتل تھا وہی خبر موت سن کر سب سے زیادہ دہشت زدہ ہوا۔ وہی سب سے زیادہ پست ہمت نظر آیا۔ رونا دھونا جزع وفزع غرض بزدلی اور بے ہمتی کی جتنی علامات ہو سکتی ہیں وہ سب اُس میں دفعتہً نمایاں ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا جیسے اوس کا دماغ معطل ہو گیا ہے اور اوس کے جسم کا تمام خون خشک ہو گیا ہے۔ اور اوس کے تمام اعضاء کی قوت سلب ہو گئی ہے بر خلاف اس کے دوسرے چار آدمی نہایت مطمئن۔ ہشاش وبشاش، بلکہ تبسم

اور خنداں نظر آتے تھے اُن کے تختہ دار پر بھی جانے سے چند منٹ پہلے۔ میں ان کے کمروں کی جانب سے گزرا تو ان چاروں بے گناہوں نے میری جانب ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اُن کے چہرے بے قصوری کے نور سے چمک رہے تھے اور ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ تھی انہوں نے مجھے دیکھا تو بہت ہی پرجوش انداز میں آخری سلام کیا۔ اور پانچواں شخص جو واقعی مجرم تھا۔ اُس کے چہرے پر جرم کی سیاہی پھیلی ہوئی، اور لبوں پر ظلم کی عفونت بکھری نظر آرہی تھی وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑا اس طرح تڑپ رہا تھا جیسے کسی نے اُسے ذبح کر دیا ہو۔ اس عبرت آفرین نظارے نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ اور مجھے ماننا پڑا۔ کہ بے گناہی ایک مستقل طاقت، ایک پائدار روحانیت ہے۔ اور جرم ایک مستقل کمزوری اور ایک پائدار کثافت ہے بے قصور کی موت و حیات دونوں مطمئن اور مجرم کی زندگی و موت دونوں دولت سکون سے محروم ہوتی ہیں۔

غرض جیل کی زندگی بجائے خود ایک مستقل زندگی ہے جس میں موعظت و بصیرت حاصل کرنے کے اتنے اہم مقامات و منازل ہوتے ہیں۔ کہ شاید جیل کے باہر ممکن نہیں۔ میری قید و بند کی تمام مدت، مدت تعلیم و تحصیل ہے۔ مجھے جیل کی تاریکی میں حقیقت و واقعیت کی بے شمار روشنیاں نظر آئیں جو اس سے پہلے کہیں

نظر نہ آتی تھیں۔ قید ہوا اور وہ بھی بکنیا ہی کی قید جو صرف قوت کی لشنگی ستمرانی کے بجھانے کی خاطر جھیلی جا رہی ہو تو پھر زندگی اتنی بے لوث اتنی خالص اتنی پاکیزہ و بلند ہو جاتی ہے کہ اس کا تصور بھی آسانی سے نہیں کیا جا سکتا مقام شکر ہے کہ میری قید کی یہی حیثیت تھی گو میرا جسم پابند اور گرفتار تھا۔ مگر دماغ اور میری روح یکسر آزاد تمام تر بے قید۔ یہ اسیری بھی کتنی مبارک تھی جس نے حقائق حیات کے مقفل دروازے مجھ پر کھلوا دیئے۔

قید و بے قیدی پر ایک طائرانہ نگاہ

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے یکم اگست ۱۹۱۵ء میں گرفتار کیا گیا۔ اور ۱۹۱۶ء کی زندان بلا کی بندشوں میں جکڑا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں جب دفتری حکومت کے پرزوں کو یہ محسوس ہوا کہ میرا وجود قصر حکومت کے بلند مرتبہ اراکین کے علاوہ خود جیل کے اسٹاف کے لئے بھی مستقل مصیبت ہے کیونکہ میں نے حتی الامکان ان کے ذوق جفا گری اور مظلوموں کے درمیان روک کی دیوار بن جانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اس کوشش میں اکثر کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ ایک قیدی کی یہ کامرانی، ان حکومت کے غلاموں کو کب برداشت ہو سکتی تھی، مجبوراً انہوں نے میرا تبادلہ بیاسے نیرد بی کی جیل میں کر دیا۔ اس جیل میں میرے ذمے خیاطی کا کام کیا گیا۔ جو ظاہر ہے کہ میرے مذاق کے مناسب نہ تھا۔ تیری

میں تنہا تھا اور میرے پانچ رفقائے مجلس بمباسہ ہی میں تھے۔

ہماری رہائی کے متعلق گورنر سے گفتگو اور اُسکے نتائج

جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ہی ہندوستانی لیڈروں نے گورنروں سے ملاقات کرکے یہ درخواست کی کہ ہم لوگوں کو جو دراصل بالکل بے قصور ہیں اگر دوران جنگ میں قابل رہائی نہیں تھے تو اب تو کوئی خاص وجہ نہیں جو رہائی کے مستحق نہ سمجھے جائیں۔ ہمکو اس قید و بند سے آزادی ملنی چاہیئے۔

گورنر نے ہندوستانی لیڈروں کی گفتگو نہایت غور و تامل کے ساتھ سنی۔ اور جواب میں کہا کہ اگر یہ چند افراد اس امر کا تحریری اقرار کریں کہ رہا ہونے کے بعد کسی ایسی تحریک میں حصہ نہ لیں گے جو حکومت کے خلاف ہو تو ان کو رہا کر دیا جا سکتا ہے ورنہ عدل حکمی کی صورت میں ان کو ملک ہی سے باہر کر دیا جائے گا۔

بمباسہ میں جو پانچ افراد تھے جب اون کے سامنے رہائی کی یہ شرط رکھی گئی تو انہوں نے اسے منظور کر لیا اور انہوں نے اپنے مصالح کے تحت اس قسم کی شرط کو مان لینا نامناسب نہ سمجھا۔ مگر میرے لئے جو اس وقت لیزوبی کی جیل میں تنہا تھا۔ یہ عقدہ اتنا آسان نہ تھا۔ جتنا میرے دوسرے پانچ ساتھیوں نے سمجھا۔ میرے ضمیر نے حکومت سے اس قسم کا سودا کرنا مطلق پسند نہیں کیا۔

کیونکہ عدل وانصاف کی ضمانت مظلوموں سے ہمدردی، اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا اور اس قسم کے دوسرے کام جو انسانیت کی خدمت کے سلسلے میں آتے ہیں اکثر مزاج حکومت پر گراں گزرتے ہیں۔ اور زبان حکومت اُن کو بغاوت اور نافرمانی سے تعبیر کرکے خود ہی مدعی بنا کرتی ہے اور خود ہی جج بن کر اپنے فریق کے حق میں ظلم وجور میں ڈوبا ہوا فیصلہ کرتی ہے۔ حکومتوں کا یہ قدیم دستور رہا ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ آخر میں نے اس مرتبہ سرکار کی کونسی مخالفت کی تھی۔ جس کی یہ سزا دی گئی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کالوں کو بھی گوروں کے برابر ہی انسان سمجھا جائے گورون کے مقابلے میں کالوں کو ذلیل وحقیر نہ سمجھا جائے۔ اور گورے رنگ میں فرق کے معنی یہ نہیں کہ کالے جسم وجان۔ عزت نہیں رکھتے لیکن میرا یہ جائز مطالبہ جو انسانیت کی حمایت میں تھا۔ بغاوت سے تعبیر کیا گیا۔ جب حکومت کی خوش فہمی کا یہ عالم ہے تو ظاہر ہے کہ اوس سے کوئی معاملت کیسے کی جاسکتی ہے۔ وہ ہماری ہر آہ کو سراسر نافرمانی اور ہمارے ہر آنسو کو سیل بغاوت سے موسوم کرکے ہمارے ساتھ جب چاہے بدسلوکی کرسکتی ہے۔ چونکہ گورنر کے الفاظ کے اندر چھپی ہوئی روح کو محسوس کرنے میں ذرا بھی وقت نہیں محسوس کی۔ میں نے صاف جواب دے دیا:۔

میں مشروط رہائی کے مقابلے میں عمر بھر کے لئے
ملک سے باہر ہو جانے کو ترجیح دیتا ہوں میں حکومت
سے اپنی رہائی کے لئے کوئی معاملت کرنا اپنے لئے
جائز نہیں سمجھتا۔ میں نے حکومت کے خلاف پہلے بھی
کوئی بغاوت کا علم بلند نہیں کیا تھا جس کی بنا پر مجھے
جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ کالوں
کو بھی گوروں ہی طرح آدمی سمجھا جائے ہمکو بھی وہی
حقوق دیئے جائیں جو اپنے ملک کے لوگوں کو دے
رکھے ہیں۔ یہ ایک جائز مطالبہ تھا جو ہر طرح جائز
ہر طرح ضروری، اور عدل کے دائرے میں تھا۔ مگر
میرا یہ مطالبہ بغاوت سمجھا گیا۔ مگر چار سال تک ظلم
وستم سہنے کے بعد بھی میرا یہ خیال محو نہ ہو سکا وہی روح
آج بھی زندہ ہے وہی خیالات اس وقت بھی
دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔

اس لئے اگر میں جیل سے آج رہائی پا جاؤں
تو میرا سب سے پہلا مطالبہ حکومت سے وہی ہوگا
جو آج سے چار سال قبل تھا اور جس کی بنا پر مجھے یہ
طویل قید کاٹنی پڑی۔ اس لئے میں یہ کر سکتا ہوں کہ میں
اس ملک ہی کو چھوڑ دوں مگر یہ نہیں کر سکتا کہ مظلوم

انسانیت کی حمایت میں کوئی آواز نہ بلند کروں۔
اگر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا ہی بغاوت ہے
تو میں بغاوت پہ مجبور ہوں۔

میرے پانچ رفقاء جو ممباسہ میں تھے انہوں نے حکومت سے مشروط رہائی حاصل کر لی تھی۔ اب میرا مسئلہ خاص تھا اسبائز میں منی لال ویسائی صاحب (انڈین ایسوسی ایشن کے معتمد) کی یہ رائے ہوئی کہ میں ایسوسی ایشن کو ایک خط اس مضمون کا لکھوں کہ ایسوسی ایشن کا نمائندہ گورنر سے ملکر بلا قید و شرط میری رہائی کے بارے میں گفتگو کرے"۔ ابھی ایسوسی ایشن کا نمائندہ گورنر کے پاس پہونچا بھی نہیں تھا کہ مجھے جیل میں یہ حکم ملا کہ میں ملک کے باہر جلد از جلد چلا جاؤں اور اس نادری حکم کے ساتھ پاسپورٹ بھی تھا۔ میں جیل میں اس حکم پانے کے بعد منتظر تھا کہ کب سرکاری فرشتے مجھے جیل سے نکالکر جہاز پہ سوار کرتے ہیں۔ اسی اثنا میں اسوسی ایشن کے نمایندے نے گورنر سے ملاقات کر لی اور تقریباً حسب مرام فیصلہ ہو گیا۔

ایک بیرسٹر صاحب کا خبط نصیحت

رہائی کو ابھی دو چار دن باقی ہی تھے کہ دیسائی صاحب مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے اُن کے ساتھ ایک بیرسٹر صاحب بھی تھے جو بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مجھے پند و نصیحت کرنی شروع کی۔ کہ رہائی کے بعد مجھے کس طرح حکومت سے ڈر کر بالکل

اُس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئیے اور مجھے کیونکر سیاسی جذبات سے کنارہ کش ہو کر پُر امن زندگی و عافیت فضا میں بقیہ صرف کرنی چاہئیے۔ مجھے بیرسٹر صاحب کی یہ عالمانہ نصیحت سخت ناگوار گزری۔ کہ یہ حضرت مجھے کس طرف لے جانا چاہتے ہیں؟

میں نے دلیائی صاحب سے دریافت کیا کہ بیرسٹر صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں کیا میں اس سے ایسوسی ایشن کی جانب سے باور کروں یا یہ بیرسٹر صاحب کی ذاتی و شخصی تعلیم ہے دلیائی صاحب نے فرمایا کہ اس گفتگو کا ایسوسی ایشن سے کوئی تعلق نہیں بیرسٹر صاحب نے اپنی جانب سے فرمایا ہے۔ دلیائی صاحب نے یہ بھی کہا کہ تمہاری رہائی کے بعد حکومت یا ایسوسی ایشن کی جانب سے تمہارے کردار پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ اور تم اپنے خیال وعمل میں صاحب اختیار ہوگے۔" اس کے بعد تو میں نے بیرسٹر صاحب کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور صاف صاف کہدیا کہ:۔

بیرسٹر صاحب! میں نے آپ سے کہیں زیادہ مدت اس ملک میں گزاری ہے یہاں کے جزئیات و کلیات کا جتنا علم مجھ کو ہے۔ آپ کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے براہ کرم یہ نصیحت آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔ اور دوبارہ اس قسم کی کوئی زحمت کبھی نہ فرمائیں۔ کیونکہ میرا اعتماد ہندوستان کے سب سے بڑے فلسفی اور شاعر کی زبان میں اس شعر پر ہے:۔

بدریا غلط و یا موجش درآویز حیات جاودان اندر ستیز است

بیرسٹر صاحب اپنا منہ لیکر آپ رہ گئے اور پھر ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا

رہائی پانے کے بعد میرے لئے

پھر وہی میدان اور وہی دوڑ

دنیا ہی نئی تھی۔ میری اس طویل مدت قید نے میرا تمام کاروبار ختم کر دیا۔ اور حصول رزق کے جو دروازے میری جد و جہد نے کھولے تھے۔ وہ سب یکسر بند ہو چکے تھے۔ میرے سامنے معاش کا سوال پھر نئے انداز میں آیا۔ کیونکہ میرے ہاتھ میں ایسی پونجی نہیں تھی جس سے میں کوئی دھندا شروع کروں۔ اور نہ میرا ضمیر اسے پسند کرتا تھا کہ میں شکم پروری کے لئے دوست و احباب کا کسی عنوان احسان لوں۔ غور و فکر کے بعد ایک راہ سمجھ میں آئی وہ یہ کہ میں سردست نیلام (آکشنری) کام شروع کروں کیونکہ اس کام میں زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ میں نیروبی میں چند ماہ رہکر ممباسہ آیا۔ اور یہاں اجازت لے کر آکشنری شروع کر دی۔ یہ کام بھی منفعت بخش ثابت ہوا۔ اور پہلے ہی سال کافی فائدہ حاصل ہوا۔ میں گرفتار ہوتے ہی اپنی رفیقہ حیات کو ہندوستان روانہ کر دیا تھا۔ مگر بعد از رہائی میں نے اُن کو اپنے پاس ممباسہ بلا لیا اور وہ حسب سابق میرے دکھ درد اور میرے کاروبار میں شریک ہوگئیں۔

کانگریس میں از سر نو شرکت

۱۹۱۴ء میں کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس کی یاد میں ہندوستانی (مقیم افریقہ) پر شدید مظالم کئے گئے تھے حکومت کی جانب سے اس قدر زیادتیاں کی گئیں تھیں کہ پھر ان میں اپنی مظلومی کے خلاف آواز بلند کرنیکا حوصلہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔ پھر دوسرے سال کانگریس کا انعقاد ان بے دست و پا مجبور ہندوستانیوں کی بس کی بات نہیں تھی۔ ۱۹۱۵ء میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔ حکومت کی اس شدت اور توانائی نے بھی ہندوستانیوں کو بالکل بے جان کر دیا۔ بمباسہ میں سیاسی تحریک کا تقریباً دم نکل ہی چکا تھا لیکن نیروبی میں سنی لعل دیسائی کی جدوجہد سے کچھ سیاسی سرگرمی ابھی زندہ تھی گو ۱۹۱۹ء میں مارشل لا منسوخ ہوگیا تھا لیکن پہلے کی سمائی ہوئی دہشت جو ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ کس طرح کم ہوتی نظر نہ آتی تھی، خوف و ہراس کی شدت نے جو تعطل پیدا کر دیا تھا۔ اس کو مٹانے کے لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بمباسہ میں اس تحریک کو زندہ کرنے کے لئے جتنی کوششیں کیں سب بیکار گئیں۔ اس لئے انھوں نے باصرار مجھے اس تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے اٹھانا چاہا اور انہوں نے کہا کہ تم اس کام کے لئے نہیں کھڑے ہوگے تو نہ صرف یہ کہ ہمیشہ کے لئے سیاسی سرگرمیوں کا دروازہ بند ہو جائیگا

بلکہ اس راہ میں اب تک جتنی قربانیاں کی جا چکی ہیں سب ضائع ہو جائینگی۔

اس وقت میرے دل کے اضطراب کا عالم نہ پوچھئے دل کا تقاضہ یہ تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے اس مبارک تحریک میں پوری دلچسپی لینی چاہئے اور جس طرح بھی ہو تحریک کانگریس میں حصہ لیں۔ اور ایک نئی مگر مضبوط مستحکم زندگی پیدا کرنی چاہئے۔

لیکن عقل کی مصلحت اندیشی کہتی تھی کہ اگر سیاسی تحریک کے دائرے میں پھر قدم رکھا تو حکومت پھر تمکو دعوت دار ورسن یا کم ازکم ضیافت زندان" سے ضرور نوازیگی۔ اور اگر حکومت نے قانون کے تحت کچھ نہ بھی کیا تو کم ازکم تمہارا موجودہ کاروبار یعنی انگریزی کا دہندہ بالکل ختم ہو جائیگا۔ تم کو اپنا مخالف دیکھکر تم سے معاملت قطعی ترک کر دینگے۔ اور تم کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائیگا

میں اس کشمکش میں تھا کہ بھگوت گیتا کی روشنی نے مجھے راستہ دکھایا۔ اور میری رفیقہ حیات نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اپنی ذاتی منفعت اور سلامتی پر اس تحریک میں شرکت کو ترجیح دوں۔ جس کی کامیابی پر دوسرے تمام بھائیوں کی فلاح و بہبود کا انحصار بھی ہے۔

مختصر یہ کہ دلیپائی صاحب نیرو بی سے بمباسہ تشریف لائے اور انہوں نے کانگریس میں میری شرکت پر مبارک باد دی

اور آئندہ میقات پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک جلسہ کرنا چاہا اور اس کے لئے اعلان عام ہوتے ہی بعض احباب آئے۔ اور یہ مشورہ دے گئے کہ خبردار تم اس جلسہ میں شرکت نہ کرنا ورنہ حکومت تم پر کوئی نہ کوئی الزام عائد کر کے پھر جیل میں بند کر دیگی۔

ادھر دوستوں کا یہ مشورہ تھا کہ اُس طرف دیسائی صاحب نے صاف صاف کہدیا تھا اگر تم نے اس تحریک میں عملی سرگرمی سے کام نہ لیا تو یہ سیاسی تحریک کی ناکامی کے تنہا تم مجرم ہوگے کیونکہ قدرت نے تم کو یہ قوت دی ہے کہ تم ان مٹے ہوئے نقوش کو پھر ابھار سکتے ہو اور تمہارا دانستہ ہاتھ سمیٹے رکھنا تم کو بے جرم نہیں قرار دے سکتا۔ یہ میرے بعض دوستوں اور دیسائی صاحب کی اپنی اپنی رائے تھی۔ اور جس رائے پر مجھے چلنا تھا وہ خود میرے دل کی تھی، جو مجھ کو پہلے بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہ اتفاق تھا کہ دیسائی صاحب کا ارشاد اور میرے ضمیر کی پکار باہم متحد نکلی۔

مختصر یہ کہ جلسہ ہوا اور بہت ہی پر زور اور شاندار ہوا میں نے لوگوں کو اس تحریک میں شرکت اور عملی سرگرمی کی موثر پیرائے میں بالاعلان دعوت دی۔ میرے معروضات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہاں تک کہ جو مخالف تھے وہ بھی موافق ہو گئے۔ کانگریس از سر نو قائم کی گئی اور پبلک نے شدید اصرار سے مجھ ہی کو اس کا معتمد قرار دیا۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس پورے طمطراق کے ساتھ پھر اسی بمبا سہ میں ہوا۔ کثیر مجمع۔ شاندار پنڈال۔ گرما گرم تقریریں، زندگی بخش تجویزیں، وطنی و قومی ترانے غرض پورے جوش و خروش کا اظہار ہوا۔

جس طرح پہلی کانگریس کا آغاز میری رفیقہ حیات نے "بندے ماترم" کے ترانے سے کیا تھا اسی طرح اس کانگریس کا افتتاح بھی انہوں نے اپنے ترانے سے کیا تھا۔ آج میری رفیقہ حیات مسرور اور بیحد خوش تھیں۔ کیونکہ ایک عظیم الشان کانگریس کے افتتاح کی عزت و سعادت اُن کو دوبارہ حاصل ہوئی۔

کوسٹ عرب ایسوسی ایشن

اسی کانگریس کے پنڈال میں عرب بھائیوں کے حقوق کی حفاظت اور سلب کردہ حقوق کی واپسی کی جدوجہد، اُن کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے "دی کوسٹ عرب ایسوسی ایشن" نام سے ایک انجمن کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔

عرب قوم جس بلندی پر تھی آج اتنی ہی پستی میں ہے اسی افریقہ میں کبھی اُن کی وہ شاندار حکومت تھی جسے یورپ کے مدبرین بھی آہنی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ انقلابات زمانے کے خونی طوفان کی رو میں افسوس آج عرب بھی زبوں حالت میں

ہیں اگر ان کی صحیح رہنمائی کی جائے تو میرا خیال ہے کہ ان کے وہ تمام نقوش جاہ و جلال ابھی ابھر سکتے ہیں۔ جن کو زمانے کی بیدردی نے محو کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا انجمن اس مقدس اور اہم خدمت کی پہلی حقیر کوشش تھی۔ جو حقیر سے ظاہر ہوئی۔ اور جس کا اعتراف وہاں کے جملہ سر برآوردہ لوگوں کو آج تک ہے چنانچہ اس کتاب کا خاتمہ انہیں کے وداعی سپاسنامہ پر کیا جائے گا۔ جو انہوں نے ہندوستان آنے وقت وداعی جلسہ میں اپنی محبت و اخلاص سے پیش کیا تھا۔

سوشل سروس لیگ ہندوستانیوں کی سماجی حالت بہتر بنانے اور ان میں معاشی ترقی پیدا کرنے کی غرض سے میری سرکردگی میں سوشل سروس لیگ قایم کی گئی۔ مسٹر کیسری سنگھ سوڈھا اور مسٹر دوسال مہتا اور دوسرے بعض نوجوانوں نے اس لیگ کے سلسلے میں میرا بہت ساتھ دیا۔ اور یہ لیگ وہاں کے ہندوستانیوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی سنتا ہوں کہ یہ لیگ آج تک زندہ ہے اور کام کر رہی ہے سچی اور مخلص میری دعائیں اُس کے ساتھ ہیں

مذکورہ بالا بمباسہ کانگریس کے ایک سال بعد نیسری کانگریس نیروبی میں منعقد ہوی خوشی کا مقام ہے کہ نیروبی کانگریس آجتک سرگرم کار ہے۔

ہندوستان کو واپسی

جولائی ۱۹۲۱ء میں افریقہ سے بغرض تبدیل آب و ہوا صرف چار چھ ماہ قیام کی غرض سے میں ہندوستان آیا۔ مگر اس مرتبہ میرے لئے اس کی خاک میں ایسی زبردست کشش محسوس ہوی کہ باوجود کوشش کے میں افریقہ واپس نہ جا سکا اور آج تک یہیں نرالے حیات بھگت رہا ہوں۔

یہ کتاب یعنی، میرے دردِ دل کی داستان نامکمل رہیگی اگر میں اپنے اُن مسلمان احباب اور مخلصین کی یاد سے پھر ایک بار اکتساب نور و ظلمت نہ کرلوں جنہوں نے اپنے انمٹ نقوش اخلاص میری سوجھ فکر و نظر پر ثبت کر دیئے ہیں اس سلسلے میں بے محل نہ ہوگا اگر میں ان کے الفاظ و کلمات کا اعادہ کروں جو انہوں نے میرے افریقہ چھوڑتے اور ہندوستان آتے وقت بعنوان "دعائی سپاسنامہ" میرے ساتھ کر دیئے تھے۔

گوشے گوشے افریقہ کے ان مسلمان بھائیوں کی

مضطرب و بے قرار یاد سے محشرستان بنے ہوئے ہیں آج بھی اُن کا تصور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا خراج وصول کر رہا ہے۔ آج بھی میری روح، اُن کی قربت کے لئے تڑپ رہی ہے۔
مگر آہ وہ کہاں۔ اور میں کہاں ــــــ ؟

ودائی سپاسنامہ

بشرف ملاحظہ عالیجناب مسٹر بکشمن مہادیو ساٹولے دام فیوضہم

جناب والا!

ہم تمام عرب قوم کی جانب سے آپ کی اس روانگی کے موقع پر دل کے عمیق ترین گوشوں میں حسرت و غم کے پرورش یافتہ جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور قلب و روح کی پوری صداقت میں ڈوبے ہوئے اور خلوص و محبت کی عطر میں بسے ہوئے خدا حافظ کہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

ہم اس اہم مشرقی افریقی نیشنل کانگریس (قایم شدہ ۱۹۱۴ء) اور انڈین ایسوسی ایشن دارالسلام سے بخوبی آشنا ہیں جن کی جناب والا نے بنیادیں ڈالکر اور اُن کو زندگی اور فلاح کے میدان میں سرگرم عمل کر کے افراد ملک و قوم کی اہم خدمات انجام دیں اس کے ساتھ ہی

ساتھ ہم آپ کے اس عظیم احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو آپ نے ۲۲ رجون کو عرب ایسوسی ایشن کے قیام کی صورت میں ہم پر کیا۔ اور اس طرح آپ نے ہمارے بکھرے ہوئے شیرازہ کو ایک مضبوط لڑی میں پرو دیا آپ نے بلا لحاظ قوم و مذہب جس طرح مظلوموں کی حمایت اور اس راہ میں جیسی بے مثال قربانیاں کیں۔ وہ سب ہمارے سامنے ہیں اور ہمارے حق میں مشعل راہ بنی ہوئی ہیں ساری قوم کو اس کا اعتراف ہے کہ آپ نے کن کن خطرات اور نازک مواقع پر، ہر قسم کے مالی و جانی نقصانات برداشت کر کے قوم کا ساتھ دیا اور کس خلوص و دیانت سے ہر موقعہ پر ان کی صحیح رہنمائی فرمائی۔

جناب معظم! آج سے دو سال قبل اس ملک میں بغرض تجارت تشریف لائے مگر آپ نے اپنے مقصد کو اپنے ابنائے جنس اور عرب قوم کے مقاصد نجات پر فیاضانہ قربان کر دیا۔ جس کے لئے ہم آپ کے صمیم قلب سے شکر گزار اور ممنون ہیں۔

آپ نے ہم سب کو ایک سیدھی راہ پر لگا دیا ہے جس پر اگر ہم آپ کی ہدایات کے مطابق گامزن رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہماری منزل مقصود خود ہمارے پاؤں چومیگی۔

ہمارے محبوب قائد! آپ کے تشریف لے جانے سے ایسوسی ایشن کانگریس اور دوسری انجمنیں ایک ایسی کمی محسوس کریں گی جو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ ان قومی و ملکی اداروں کے کام کرنے والے

ہر وقت اور ہر حال میں آپ کی بیش بہا ہدایات کے محتاج رہیں گے۔

آپ کے یہ شاندار روایت رہبری اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں آپ جب اور جس قوم کی رہنمائی کرینگے وہ قوم بہت جلد اپنی مطلوب ومقصود لیلےٰ ترقی، اور سلمائے فلاح وبہبود سے ہم آغوش ہو کر رہیگی

ہم ہیں کونسٹ عرب ایسوسی ایشن" کے ترجمان

(۱) رشید بن سعود صدر

(۲) سلیمان بن رشید نائب صدر

(۳) مسلم بن قاسم خازن

(۴) حیدر محمد۔ معتمد

مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء